

# نامہ ہائے فارسی غالب

## اردو ترجمہ

ترتیب فارسی متن  
سید اکبر علی ترمذی

اردو ترجمہ  
پرتو روہیلہ

ادارہ خیاد گار غالب

# نامہ ہائے فارسیِ غالب

(اردو ترجمہ)

ترتیب فارسی متن:  
سید اکبر علی ترمذی

اردو ترجمہ:

پرتور و ہیلہ

ادارہ یادگارِ غالب

کراچی

# سلسلہ مطبوعاتِ ادارہٴ یادگارِ غالب

شمارہ: ۳۳

رفیق احمد نقشب

فنی مجموعہ:

۱۹۹۹ء

طباعتِ اول:

احمد براہوڑ، ناظم آباد، کراچی

طابع:

ایک ہزار

تعداد:

ایک سو بیس روپے

قیمت:

## ادارہٴ یادگارِ غالب

پوسٹ بکس نمبر: ۳۳۶۸

غالب لاہوری

دوسری چورنگی، ناظم آباد

کراچی ۷۴۶۰۰

## فہرست

۷	پد تورو جیلہ	پیش گفتار
۱۵	قاضی عہد الودود	پیش لفظ
۱۷	سید اکبر علی ترمذی	دیباچہ
۲۱	سید اکبر علی ترمذی	مقدمہ
۵۳		غالب کے سفر کی توقیت
۵۹		خلوط (اردو ترجمہ)

## ضمائم از مرثب

۱۵۵	ضمیمہ ۱:
۱۵۷	ضمیمہ ۲:
۱۷۹	ضمیمہ ۳:
۱۸۱	ضمیمہ ۴:
۱۸۳	ضمیمہ ۵:

## ضمائم از مترجم

۱۸۷	ضمیمہ ۱:
۱۹۹	ضمیمہ ۲:
۲۰۱	ضمیمہ ۳:
۲۰۸	شخصیات

## مجلسِ ادارت برائے اشاعتِ کتب

صدر، ادارہ یادگار غالب	بیگم جمید ملک
سیکرٹری جنرل، ادارہ یادگار غالب	مختار ذہن
سیکرٹری، ادارہ یادگار غالب	رعنا فاروقی
جوائنٹ سیکرٹری، ادارہ یادگار غالب	ڈاکٹر مشرف احمد

ہارسہ شمالی

## پیش گفتار

اولیٰ تو "ناسر ہارسہ فارسی غالب" (مرثیہ سید اکبر علی تردہی و مطبوعہ غالب اکیڈمی، نئی دہلی) کا نسخہ ہی تھیں جنہیں مختار۔ اسلام آباد کے گئے چٹے غالب شناس، ایک نے کتاب کی موجودگی سے انکار نہ کرتے ہوئے مجھے آگاہی دی کہ ان کی ساری کتابیں قواعد میں ہوتی ہیں۔ دوسرے نے کہا، "مختار میاں، میں نے تو یہ نام ہی نہیں سنا۔ پھر بلا میں تحقیق کا آدمی کہاں ہوں۔" اب کیا کیا ہائے۔ ایک دو کتب خانے جو تھے، وہ بھی دیکھ لیے، مایوسی ہی مایوسی، کہ یکایک مجھے کتاب خانہ گنج بخش فارسی کا خیال آیا اور پھر براہِ دم محمد حسین قسیمی قرطاس دہلی پر ابھرے۔ ان سے فون پر بات ہوئی اور انہوں نے فوراً بغیر کسی توقف کے جواب بھی دے دیا، "موجود است۔"

دوسرے دن جب کتاب میرے ہاتھ میں تھی تو کتاب کی کم روئی ہی نے شوق پر اوس ڈال دی اور اس خیال نے کہ اس کا پتلے بھی ایک ترجمہ ہو چکا ہے، مجھ سے کتاب کھولنے کی توفیق بھی سلب کر لی۔ کراچی کے ایک عزیز سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے اس طرح اور ایسے الفاظ میں تشویق دلائی کہ میں ورق گردانی پر راضی ہو گیا۔ رہا اس کا ساتھ ترجمہ تو اس کے بارے میں ان کے الفاظ مجھ اس طرح کے تھے، گویا اس کا ترجمہ ہوا ہی نہ ہو۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ دہری نشین کراویا کہ غالب کے فارسی خطوط میں یہ سارے خطوط ہر لحاظ سے انتہائی اہم ہیں، تاریخی استہدات کے علاوہ انشا پر داری کے لحاظ سے بھی ان کی بڑی قدر قیمت ہے۔ غرض میں کتاب کی ورق گردانی پر راضی ہو گیا۔ پہلا ہی صفحہ پڑھا تو سناٹے

میں آگیا۔

کھم ازا ختم کہ در سحر ختم باید نہ

بیش ازانی کہ دی غلبت تقصیر مرا

ندامت خالصہ آپہنگ گزراش صبح اعلیٰ کہ وارو۔۔ آبروی معنی نہ رہتی۔۔

دو ہار معنی آگے نظر ڈالنا تو صبح بند اس کے اشعار کے بعد، یہ سطر میں نظر آئیں:

بہکم و غیور دل فریبی این تماشا گاہ، غم خرمتم از دل فراموش است و بہ

ہجوم لفظ یاد ناگوسی این صدم کدہ دل از اترکزور خروش۔

اور تصور اس آگے بڑھ کر جب میں ان لفظ پر پہنچا:

این سحر سترگ در پیش در دل از بیم شاستہ اہر اریش نہ بودی، بی

کایا ترک دین کردی و شوہر بستی و ختم فرو کشیدی و زنا فرو بستہ، تا

پدیں و منہ چندین بر کنار گنگ قستی کہ گرد آگاہی ہستی از خود فرو

شستی و چون قظرہ بہ دریا بہو ستی۔

تو یقین کیجیے، میں حیرت اور سرشاری کی اس کیفیت میں تھا جس میں طالع ساری زندگی اور

مصل بادشاہ صرف بوقت تحت نشینی ہوا کرتے تھے۔ سو میں نے عزیزند کور سے "نامہ ہاسے

فارسی غالب" کے ترجمے کی پائی بھری اور اس کتاب کو سمجھنے کی سہ پڑھنا شروع کر دیا۔

ان سارے خطوط میں سوائے ان دو خطوط کے جو غالب نے "صنعت تعطیل" میں لکھے

ہیں، اور جو پہلے خط کا حصہ ہیں، ایسی جگہیں خال خال ہی آتی ہیں جہاں آپ کی دل چاہی میں

کھی آتی ہو، یا آپ کا جی اہاث ہوتا ہو۔ سو میں نے تو ان خطوط کو پڑھتے وقت وہ لطف اشایا

ہے جو کسی آشنا سے لوب کو لوب کے کسی شاہ کار کے مطالعے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگرچہ

اس مطالعے میں قدم قدم پر ہد مزی اور بے لطفی کے مراحل بھی آئے لیکن تخلیق کی مجموعی

ہاذا بیت ہر جگہ برقرار رہی۔ آپ کہیں گے کہ لوب کے اس شاہ کار میں ہد مزی اور بے لطفی

کیسی اتواس کی تفصیل یہ ہے کہ اصل خطوط چوں کہ کرم خوردہ حالت میں تھا چنانچہ حاصل

مرتب نے انتہائی دیدہ وریزی اور کھکاوی سے ان کرم خوردہ جگہوں کو اپنے قیاس سے ہد کیا۔

پھر بھی جو جگہیں رہ گئیں، وہاں نقطہ لگا دیے۔ مرثب کو چوں کہ ایک ایک لفظ پڑھ کر معنی کے ساتھ جملہ ترتیب نہیں دینا تھا، اس لیے وہ مکتوبات کے مرکزی مفہوم سے مکتوب الہ کا نام معلوم کر کے یا خطوط کی زبانی ترتیب کا ہدف پورا کر کے کتاب ہمارے حوالے کر گئے۔ اب مترجم کے سامنے دو مشکلات تھیں، ایک تو کرم خوردگی اور دوسرے اس خوب صورت اور دل کش نثر کی روانی میں قدم قدم پر نقطہ زدہ جگہوں کا آہانا۔ شروع شروع میں تو براہِ رم صتیق غفر (ڈاکٹر جنرل نیشنل آرکائیوز، اسلام آباد) نے امید دلائی تھی کہ وہ دلی سے اس خطوط کی مائیکرو فلم منگوا دیں گے لیکن باوجود کئی یا دو ہانپوں کے ان کے ہندوستانی ہم کار نے کوئی تعاون نہ کیا۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ اگر مائیکرو فلم آجائے تو کم از کم ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ خالی جگہ ایک لفظ کی ہے یا ایک سطر کی۔ ہر حال، یہ نہ ہو سکا اور خالی جگہیں اسی طرح رہ گئیں۔

یہ ترجمہ، جو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، ایک بنیادی مفروضے پر مبنی ہے اور وہ مفروضہ یہ ہے کہ اس ترجمے کو پڑھنے والا ایک متوسط درجے کی علمی استطاعت کا قاری ہوگا، یعنی کوئی پرائمری کا طالب علم اس کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اس مفروضے پر اس ترجمے کی بنیاد رکھنا اس لیے ضروری تھا کہ ہر لفظ اور ہر فقرے کا ترجمہ کرنا اصل متن کی روح کو زخمی کرنے کے مترادف تھا، جب کہ میں چاہتا تھا کہ اردو کا عام قاری بھی اس نثر سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس خیال کے یہ نظر میں نے متعدد الفاظ، بہت سے فقرے، اکثر اظہار و آداب کو جوں کا توں رکھا، ان کا ترجمہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وجہ یہی تھی کہ متوسط استعداد کا اردو دان لن الفاظ کا مفہوم سمجھتا ہے۔ اس لیے خوب صورت نثر کے ان جڑے ہوئے موتیوں کو مترادفات کے شعروں سے نہ توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ترجمے کے ذیل میں مترادفات بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے، مترجم مترادفات کے بغیر ایک دم آگے نہیں چل سکتا۔ لیکن یہ بھی ہر زبان کی ایک عموماً جگہ ہے کہ اس کا ہر لفظ، بزمستحیات کے، ایک ایسی آکائی ہے کہ کوئی دو مترادف مشکل ہی سے اس کی معنوی وسعت پر محیط ہوتا ہے، یا اس کے کنارے کھلے رہ جاتے ہیں یا اُس کے، سو اس



ترجمے میں سیری کو شش یہ رہی ہے کہ اپنے قاری کو غیر ضروری مترادفات کے انبوه سے بچاؤں تاکہ معنوی صحت برقرار رہے۔

غالب کی شکر کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے تمام وقت یہ خیال رہا ہے کہ قاری تک اس کی لطافتِ خیال بھی پہنچے ورنہ لطافتِ خیال کی ان کیاریوں کو چاند لے ہوئے بڑی آسانی سے ہاماورہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں مسافت بھی کم ہو جاتی ہے اور الفاظ کا صرفہ بھی۔ مثلاً ”عطری گلی مرلورہ حذہ جوس و نالم“ کا بڑا آسان ہاماورہ ترجمہ یہ ہو گا کہ ”میں اپنا مقصد حاصل کروں،“ یا ”میں اپنی مرلورہ حاصل کروں۔“ اسی طرح ”قصیدہ کہ در دج خدام جناب ناظم الملک مشرفانس پاکینس ہماورہ بہت جنگ از رگہ کلک فرو رختہ است، رقم می گوو،“ کا ہاماورہ ترجمہ یہ ہو گا کہ ”وہ قصیدہ جو ناظم الملک فرانس پاکینس ہماورہ کی دج میں کہا گیا ہے، تحریر کیا جاتا ہے۔“ ذرا سوچئے، کیا اس ہاماورہ طریقہ اظہار میں گفت گو کے وہ سارے رنگ آگئے جو معنفت چاہتا ہے۔ سیرے خیال میں نہیں۔ لہذا میں نے ترجمے میں کوشش کی ہے کہ اظہار کا یہ بالواسطہ طریقہ بھی قائم رہے اور قاری پر بات کہنے والے کی ندرت خیال بھی آشکار ہو جائے۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ آج کا قاری ڈیڑھ دو سو سال پہلے کی تہذیب اور اس تہذیب کی زبان و بیان سے بھی کماحقہ باخبر ہو سکے۔ ہر دور کی زبان اس دور کی تہذیب کی عکاس ہوتی ہے۔ سیرے خیال کے مطابق ایسا ہاماورہ ترجمہ، جو اس دور کی تہذیب کی اور طرزِ زبان کی عکاسی نہ کرتا ہو، غیر حقیقت پسندانہ ہو گا۔

اب آئیے گرم خوردہ جنگوں کی خانہ پردی پر۔ فاصل مرتب نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ انھوں نے ان خطوط کا، جو دوسری جگہ بھی ملتے ہیں، مثلاً ”بیج آہنگ“ و ”غیرہ میں، مقابلہ کر کے حتی الامکان خالی جگہوں کو بھر کر دیا ہے۔ اس کے باوجود جو جگہیں رہ گئی ہیں انھیں اپنے قیاس سے بھر کر کے بریکٹ میں لکھ دیا ہے۔ تاہم اس کے بعد بھی جو جگہیں رہ گئی ہیں، انھیں نقطے لگا کر چھوڑ دیا ہے۔ تحریر یا ہی کام میں نے بھی کیا ہے۔ سیراکام ذرا زیادہ طویل اس لیے ہو گیا ہے کہ مجھے ترجمہ بھی کرنا تھا اور یہ بھی دیکھنا تھا کہ حق میں کیا لکھا ہے۔ لہذا جہاں تک حق کا مضموم ساتھ دیتا ہے، وہاں بریکٹ لگا کر ”تجاسی“ لکھ کر اپنا امتنا

کھدوایا ہے۔ لیکن جہاں جھلے کی ترتیب ٹوٹ جاتی ہے اور مضموم بھی ساتھ نہیں دیتا، وہاں نثر کا وہ ٹکڑا کھڑک کر [نامکمل] کھدوایا ہے۔ جو جلد بظ اظا کا ہیں، صرف ان کا اسی صورت سے ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ مثنیٰ:

لعنتِ خدا بر آبی خرابہ باد کہ نہ دہوی دوائی در خود بیمار و نہ مٹا می  
شائستہ مردم برسم۔ مرد و زلش ناہیدہ او مہر و آزد م از طبع پیرو جواش  
مٹم۔

ترجمہ:

اس ویرانے پر خدا کی لعنت بر سے کہ وہاں نہ تو بیمار کے لیے دوائی  
ہے اور نہ کسی مہذب انسان کی ضرورت کی کوئی چیز دست یاب ہوتی  
ہے۔۔۔ اس کے لوگوں میں نہیں اور محبت و حیا وہاں کے پیرو جواں  
میں نایاب ہے۔

۲۔ مثنیٰ:

سوادش سراپہ نوسپاہی آفاق و خراب آبادش مرز (کذا) دو سنزد۔

ترجمہ:

اس کے نواح و اطراف دنیا کے لیے سراپہ نوسپاہی اور اس کی ویران  
آبادی [مرزا (کذا) دو سنزد۔] [نامکمل]۔

۳۔ مثنیٰ:

روز و دو روز بنارس باد جہاں فراو لسی۔ آسا از جہت مشرق وزید۔

ترجمہ:

بنارس پہنچنے کے دن باد جہاں فراو لسی۔۔ (اکیسی: روح) آسا مشرق  
کی جانب سے چل رہی تھی۔

آئیے، اب اصل مظلومے کے کاتب کی کارستانیاں آپ کو دکھائی جائیں،

-۱-

مسائلہ سودا گریہ المرام، دلِ گرم سر، سراسر کرم مولار اور بادہ (کذا)  
اسیدِ کم طلع سرود کردہ۔

بست عورہ غرض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ اصل میں "دہ پارہ اسیدِ کم طلع" ہے۔

-۲-

دلِ دردِ مرم، دوا مرموم، طبع مرم وادو۔

عقلمندوں اس لفظ "طبع" پر غور کیا۔ کوئی لغت ساتھ نہیں دیتی اور کسی طرح یہ لفظ اپنے معنی کے ساتھ اس سیاق و سباق میں نہیں بیٹھتا تھا۔ آخر کار ایک دم کوئٹہ اسالیکا اور معلوم ہوا کہ یہ لفظ "طبع" ہے، جسے "طبع" لکھا گیا ہے۔

-۳-

امجازِ آں مشیتِ ہوا ظہارم را چوں طمع فتح براواشت۔

جب کہ ہوتا یہ چاہیے تھا، امجازِ آں ہوا مشیتِ ظہارم را چوں طمع فتح براواشت۔

-۴-

دہ ہر گام از خار و خارہ بروم تیغِ مالل گاہ لڑاشت بُدولیا (کذا) المسرود و

رنجورہ گاہ از تالم گوش ایام ستم رسیدہ نالائی۔

اب غور کیجیے، اس جملے میں "بُدولیا" کس طرح آسکتا ہے۔ اس جگہ انتہائی غور کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر کاتب سے بہت بڑا سو ہوا ہے۔ اس لفظ سے تو بیچلے کا مطلب ہی خبط ہو جاتا ہے۔ اتفاق سے چل کہ یہ خط مجلسِ یادگارِ خلیفہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی مطلوبہ "تیغِ آہنگ" میں بھی شامل ہے، اس لیے اس سے مقابلہ کرتے وقت یہ گنتی خود بخود کھل گئی اور معلوم ہوا کہ یہ "بُدولیا" نہیں، "بُدولیا" ہے۔

اب بات سوازلے کی شروع ہوتی ہے تو یہ بھی بچاتا چلوں کہ اس مختصر سے سوازلے نے تو بڑے بڑے انکشافات کر دیے۔ ظاہر ہے کہ میرا ہدفِ گفت کو صرف وہ خطوط ہیں

جو مطبوعات مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی ۱۹۶۹ء کی سینڈ وزیراعلیٰ مابدی کی تصدیق و توثیق و نگرانی میں چھپی ہوئی "بیج آبہنگ" کے صفحات ۴۰۲ سے ۴۱۹ تک ہیں۔ یہ خطوط ہاندے کے محمد علی خان کے نام ہیں اور شمار میں کل سات ہیں۔ دوسرے خط کے بعد بجائے نمبر ۳ کے نمبر ۲ آجاتا ہے اور اس طرح نمبر ۱ تک سارے نمبر غلط ہو جاتے ہیں۔ خیر، یہ تو گنتی کی بات ہوئی جو اتنی پریشی غلطی نہیں ہے، تاہم ایک طائرانہ سی نظر ڈالنے میں خطوط کے متن میں جو غلطیاں نظر آئیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ خطوط کا خط نمبر ۳۱۳: "ناہار شبی در وہی اتفاقیت الخاں"

مجلس یادگار غالب کا خط نمبر ۲: "ناہار شبی یہ وہی اتفاقیت الخاں۔"

۲۔ خطوط کا خط نمبر ۳۱۳: "زہرہوی بھول لالہ احوال چوں نام جناب شنید نامہ بہ مجرا از من طلب کرو۔"

مجلس یادگار غالب کا خط نمبر ۱۲: "زہرہوی بھول لالہ احوال چوں نام جناب از من شنود نامہ بہ جبر از من طلب کرو۔"

مندرجہ بالا اخطاؤں سے پتا چلتا ہے کہ یہ تصدیق و توثیق مابدی نے ان کتابوں کی طبعیت اور ان کے متن کی درستگی میں کس قدر کاوش کی ہے۔ میں نے ان سارے خطوط کا موازنہ نہیں کیا ہے۔ اگر بالکل موازنہ کیا جائے تو ہو سکتا ہے اور بھی غلطیاں ظاہر ہوں۔

"نامہ پای فارسی غالب" کے فاضل مرثب سید اکبر علی مدنی نے بھی اپنے مامانہ دیا ہے میں کہتا ہوں اور ویسے بھی یہ امر تحریراً بھر غالب شناس کے علم میں ہے کہ اس خطوط کے چند خطوط ایسے ہیں جو "بیج آبہنگ" میں بہت پہلے چھپ چکے ہیں۔ یہ خطوط نمبر وار یہ ہیں: ۴، ۳، ۵، ۷، ۸، ۱۰، ۱۶ اور ۳۱۔ اگر ان خطوط کا موازنہ ان خطوط سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ چنانچہ میں نے خط نمبر ۲ اور خط نمبر ۳ کا موازنہ کر کے ان کے اختلافات درج کر دیے ہیں۔ اگرچہ خط نمبر ۲ کے انتخاب سے اختتام تک کل نو سطریں بنتی ہیں، تاہم ان نو سطروں میں متن کی بارہ غلطیاں ہیں۔ اسی طرح خط نمبر ۳ میں اٹھارہ سطریں ہیں اور اس میں متن کے تیرہ اختلافات ملتے ہیں۔ پھر بھی ہم کہہ

کھتے ہیں کہ یہ وہی خطوط ہیں، باوجودے کہ ان پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ لیکن ہائی چر خطوط تو سوائے ایک دو پیرا گراف کے اشتراک کے سراسر مختلف ہیں اور ان کا کسی صورت سے زیرِ نظر خطوط کے خطوط سے موازنہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ مثلاً خط نمبر ۵ اس خطوط میں چار سطروں پر محیط ہے، جب کہ "تراج آہنگ" میں یہ خط صرف دو صفحات پر ہے۔ ان امور کے پیشِ نظر خطوط نمبر ۵، ۳، ۷، ۸، ۱۰ اور ۱۶ کو منجیسے کے طور پر مطالعہ و خالی کر دیا گیا ہے، تاکہ ہماری موازنہ کر کے خود کو سکھیں کہ ان خطوط میں کس قدر فرق ہے۔

ترجمے کی عبارت کو بے ربطی کے صدوں سے محفوظ اور گفت گو کی روانی کو قائم رکھنے کے لیے میں نے کہیں کہیں خود میں میں "چوں کہ"، "بلکہ"، "لہذا" اور "لیکن" قسم کے الفاظ بڑھا دیے ہیں۔ اس قسم کے اضافے میں نے بعض ایسی جگہوں پر بھی کیے ہیں جہاں مضموم میں وہ الفاظ نہاں ہیں، تاہم عبارت میں موجود نہیں۔ اس ساری کاوش کے باوجود جو میں نے اس ترجمے کے ضمن میں کی ہے، بعض مقام ایسے ہیں جہاں مضموم واضح نہیں ہو سکا ہے۔ ایسے مقامات کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

آخر میں مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ اگر کمری و تھودی ڈاکٹر سیط حسن رضوی کی بے پایاں شغف جیسے حاصل نہ ہوتی تو یہ ترجمہ مکمل نہ ہو پاتا۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ ان کا ٹکڑہ لیا کر سکوں۔ ساتھ ہی میں اپنے دوست سید سعید اللہ اور ہم دم ویرنہ محمد حسین کسیمی کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے وقت بوقت گاہ بے گاہ جس خند و ہوشانی سے اپنے کام پر میرے فوقی لوب کو ترجیح دینے کو میری مدد کی ہے، وہ قابلِ ستائش ہی نہیں ناقابلِ فراموش بھی ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ یہ ترجمہ آپ کی پسند پر پورا اترے۔ (آمین!)

پر تورو پیلہ

## پیش لفظ

سید علی اکبر ترمذی نے غالب کے فارسی خطوط کی دریافت سے غالب کے سفرِ گلشن کے بارے میں ہمارے علم میں قیمتی اضافہ کیا ہے، انہوں نے ان خطوط کو ایک جامع تصارف کے ساتھ مرتب کیا ہے اور برہمی محنت سے طائر کے بیانات کا اُن خارجی شواہد کے ساتھ مقابلہ کیا ہے جو حکومتِ ہند کے سرکاری ریکارڈ میں دستِ یاب ہیں، غالب کے ذہن پر جو مختلف اثرات کار فرما تھے، ترمذی صاحب نے قابلِ تعریف انداز سے اُن کا تجزیہ کیا ہے، اگرچہ مجھے اس میں شبہ ہے کہ غالب کے اسلوب پر فورٹ ولیم کالج اثر انداز ہوا۔ مزید یہ کہ ترمذی صاحب نے ان خطوط کی تاریخی ترتیب، مثنیٰ کی قربانی مست پیش کش اور ان اشخاص و مقامات کی شناخت میں، جن کا ذکر ان خطوں میں آیا ہے، خاصی دقتِ نظری سے کام لیا ہے۔ کتاب میں طباعت کی جو غلطیاں ہیں، انہیں پروف خوانی کے دوران دور کیا جاسکتا تھا، تاہم اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں کئی واقع نہیں ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے غالب پر تحقیق کے نئے در واپہں گے۔ ترمذی صاحب نے "Ghalib and the State" کے موضوع پر جس کتاب کے لکھنے کا وعدہ کیا ہے، میں بڑے اشتیاق سے اس کا منتظر ہوں۔

قاسمی عبدالودود

\* \* \*



## دیباچہ

اس کتاب کا ایک مقصد قارئین کی خدمت میں غالب کے فارسی خطوط کا ایک بے مثال مجموعہ پیش کرنا ہے، اور انہیں ان خطوط کی دریافت سے حاصل ہونے والے مسرت آمیز جوش و خروش میں شریک کرنا ہے۔ یہی نہیں، ان خطوں سے غالب کی زندگی اور اس کی شاعری کے بارے میں جو نئے حقائق سامنے آتے ہیں، انہیں جاننے کی مسرت میں بھی قارئین کی شرکت مطلوب ہے۔ وہ ۳۱ خطوط اور ۵ ضمیمے، جو اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں، نوعیت کے اعتبار سے ایک جیسی تحریریں ہیں، جو غالب کے سفرِ گلشن سے تعلق رکھتی ہیں۔ غالب نے دہلی سے یہ سفر براہِ فیروز پور، پھر کرا، کان پور، لکھنؤ، ہاندوا، لاہ آباد اور مرشد آباد کیا تھا۔ اس سفر کا آغاز ۱۸۴۵ء کے اختتام پر ہوا تھا۔ اس کے تقریباً پانچ سال بعد ۲۹ نومبر ۱۸۴۹ء کو غالب واپس دہلی آئے۔

خطوط کے اس مجموعے کا خطوط نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نے ۱۹۶۰ء میں میری فرمائش پر خریدا تھا۔ چوں کہ اس کا موضوع میرے دائرہ کار سے باہر تھا، اس لیے میں نے اپنے دوست قاضی عبدالودود سے، جو غالبیات پر درجہ استیلا رکھتے ہیں، درخواست کی کہ وہ اسے مرثب کر دیں۔ انہوں نے بے تاہل میری درخواست قبول کی اور اپنے تحقیقی جملے ”تحقیق“ کے ۱۹۶۱ء کے شمارے میں چھ خط شائع کیے، لیکن اس کے بعد، اپنے زیادہ توجہ طلب کاموں کی وجہ سے، انہیں اس کام کے لیے وقت نہ مل سکا اور گزشتہ اکتوبر میں انہوں نے یہ تہذیب کیا کہ اس کام کو میں خود انجام دوں۔

میں نے جب اس مجموعے کو بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کام کے نہم دہنے میں متعدد مشکلات درپیش ہیں۔ اول یہ کہ میرے پیش نظر اس مجموعے کا صرف ایک نسخہ تھا، اور



اسی سے متن مرثب کرنا تھا۔ دوسرے یہ کہ خطوط روروی میں لکھا گیا تھا اور طبرہا نوس خط میں تھا۔ تیسرے، متعدد مقامات پر یہ گرم خودہ تھا۔ ان مشکلات کے باوجود میں نے صحیح متن کے بازیافت کی پوری کوشش کی ہے، تاہم بعض مقامات ناخوانا رہ گئے ہیں، جن کی نشان دہی متعلقہ مقامات پر، مختلف اشارات کے ذریعے، کر دی گئی ہے۔

خطوں کی ترتیب کا مسد بھی خاصا مشکل تھا، کیوں کہ خطوطے میں شامل خطوط کے حاسح نے یہ کام برہمی سے ترتیبی اور ابتری سے انجام دیا تھا۔ میں نے سوہا کہ ان خطوں کو تاریخی تسلسل سے مرثب کیا جائے، مگر یہ کسی طرح بھی آسان نہ تھا۔ کچھ خطوں میں سرے سے تاریخیں ہی درج نہ تھیں، اور اگر تھیں بھی تو سنیں کا اندراج نہ تھا۔ مزید یہ کہ صرف ایک خط پر مکتوب الیہ کا نام درج ہے۔ اس صورت حال میں ان خطوں کی ترتیب کیا ہو؟ ایسے معاملات میں رہ نمائی صرف داخلی شواہد ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس طریق کار پر عمل کر کے مجھے برہمی حد تک کام پائی حاصل ہوئی ہے۔ دو کے سوا باقی سب مکتوب الہم کو میں نے شناخت کر لیا ہے، اور خطوں کو تاریخ وار یک جا کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہتر شواہد کی عدم موجودگی میں زیادہ سے زیادہ یہی کچھ کیا جا سکتا تھا۔

تاریخی تسلسل پر قرار رکھنے کے طریق کار سے قطع نظر، اس مادے مولو کو پرکھنے کے لیے میں نے ادب کے بجائے تاریخ سے رہ نمائی حاصل کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی رویہ قطعی طور پر ادرسی ہے، ورنہ غالب کے ذہنی و فنی ارتقاء کے بارے میں جو اسے قائم کی جانے گی، درست نہ ہو گی۔ دراصل اس طریق کار سے ہمیں یہ جاننے میں مدد ملتی ہے کہ غالب کے وہ خاص رجحانات اور میلانات کب اور کیسے صورت پذیر ہوئے جو برہمی قوت کے ساتھ اس کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔

اس طریق کار کا صریح نتیجہ یہ ہے کہ میں نے اس مجموعے کے مندرجات کا، جہاں تک ممکن تھا، غالب کی دوسری تحریروں اور متعلقہ دستاویزات سے مقابلہ کرنے اور ان کے باہمی ربط کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیر نظر مجموعے کے خطوط کا بنیادی موضوع غالب کی وہ عرضداشت ہے جو برطانوی حکومت کو اس مقصد سے پیش کی گئی تھی کہ احمد خاں

نے ان کے (غالب کے) معاملے میں جو غلطی کی تھی، اُس کا ارتکاب کیا جائے۔ غالب کے موقف کی وضاحت کے لیے میں نے (زیر نظر کتاب کے) ضمیموں میں کئی دستاویزات کے عکس بھی شامل کیے ہیں۔ جیسے لارڈ لیک کا چارٹی کردہ پروانہ، مؤرخ ۳ مئی ۱۸۰۶ء بنام احمد بخش خاں، ۷ جون ۱۸۰۶ء کی متنازع دستاویز کا مسودہ، غالب کی وہ عرضداشت جو حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری سامنٹ فریزر کو اُس کے درودِ گلشن پر پیش کی گئی تھی۔

خطوط اور دستاویزات، جو یہاں پیش کی جا رہی ہیں، ان کے مطابق غالب کی پیش کا قضیہ ۱۸۳۱ء کے آغاز میں اُس وقت شروع ہوتا ہے جب لارڈ ولیم بینٹک، گورنر جنرل نے غالب کے خلاف فیصلہ دیا تھا۔ غالب اس فیصلے سے شکستہ خاطر نہ ہوئے اور اُنہوں نے کورٹ آف ڈائریکٹرز کو لندن میں اپنی عرضداشت بھیجی جو بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد غالب نے ملکہ وکٹوریہ سے اپیل کی لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی وجہ سے یہ معاملہ طاقی نہیں کی نہشت بن گیا۔ اس معاملے پر جو سرکاری کارروائی ہوئی اُس کا حاصل وہ ساری خط و کتابت ہے جو اب بھی محفوظ ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ یہ خط و کتابت میں اپنی کتاب "Ghalib and the State" میں پیش کروں گا۔

آخر میں یہ اعتراف کروں گا کہ اس کتاب پر میں اتنا وقت صرف نہیں کر سکا جتنا میں کرنا چاہتا تھا، اور جو وقت صرف کیا وہ اُس سے کہیں کم تھا جتنے وقت کی اس کام کے لیے ضرورت تھی۔ اُن متعدد مسائل کی، جو ان خطوط کے ذریعے سامنے آتے ہیں، مکمل تحقیق سے میری مصروفیات نے مجھے باز رکھا۔ غالب اکیڈمی کے ادیبِ اختیار یہ چاہتے تھے کہ غالب کے صد سالہ یومِ پیدائش کی مناسبت سے ایک ہفتے تک منعقد ہونے والی تقریبات کے دوران یہ کتاب شائع ہو جائے، لہذا میں نے مختصر وقت میں اس کام کو مکمل کرنے کی عاجزانہ کوشش کی۔

میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اکیڈمی کے چیئرمین حکیم عبدالملک صاحب کا، جنہوں نے اس منصوبے کی

افزائی کی اور مالی وسائل فراہم کیے۔

اکیڈمی کے سیکریٹری عتیق صدیقی صاحب کا، جن کی آن تک کو مشنوں کے نتیجے میں یہ کتاب بروقت شائع ہوئی۔

قاضی عبدالغود صاحب کا، کہ میں نے جب بھی اُن سے مشورہ کیا، اُنہوں نے اپنے وقت اور توضیحات سے فراخ دلی سے مجھے نوازا۔

فارسی متن کی نقل تیار کرنے اور اس کے ہروف پڑھنے میں مولوی عبدالغفور اعظم عباسی صاحب سے مجھے بڑی مدد ملی ہے۔ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے لائبریری ہے اسے واحد صاحب نے انگریزی متن کے ہروف پڑھنے اور اشاریہ تیار کرنے میں سیری مدد کی ہے۔

ایس اے آئی ترمیمی

نئی دہلی

۱۳ فروری ۱۹۶۹ء

\* \* \*

## مقدمہ

### (۱)

زیر نظر اشاعت غالب کے ان خطوط پر مبنی ہے جو ایک مختصر بہ فرو خطوط کی شکل میں موجود ہیں۔ یہ خطوط اس عظیم شاعر کے اس سفر کا وہ نادر اور نامیاء غیر معروف ریکارڈ ہیں جو اس نے اپنے مرحوم بچا لعل اللہ بیگ خان کی پٹنن سے اپنی وراثت کے حق کو منوانے کے لیے اختیار کیا تھا۔ بنیادی طور پر یہ خطوط ایک ادب پارہ ہیں، لیکن ضمناً ریاست اور معاشرے کی بابت غالب کے نقطہ نظر کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ ان خطوط سے ان اثرات کی نشان دہی بھی ہوتی ہے جو اس سفر نے شاعر کے ذہن پر مرتب کیے اور جی کی عکاسی بھرپور انداز میں اس کی شاعری میں بھی ہوئی۔

### (۲)

زیر نظر مجموعہ خطوط کا صحیح تناظر میں مطالعہ کرنے کے لیے ابتدا ہی میں یہ جان لوٹنا ضروری ہے کہ غالب خط لکھنے کے بہت شوقین تھے۔ اب جوں کہ ان کے مکتوب الہم زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی سمجھائی ستانا غالب کی فطرت تھی، سو یہ خطوط نہ صرف یہ کہ ان کی سوانح سے متعلق مواد فراہم کرتے ہیں، بلکہ ان کی شاعری کی بھی کافی حد تک تشریح و توضیح کرتے ہیں۔ ان خطوط سے جہاں ان کی شاعری کی محرک قوتوں کی نشان دہی

ہوتی ہے، وہیں اس جھنجھٹے کے سیاسی و سماجی حالات سے بھی شناسائی حاصل ہوتی ہے جب ہریم اور سہ سنگت و رفعت کا شمار تھے اور فرسودہ نظام حکومت ظہیر مرئی طور پر ایک ایسے صنعتی عہد کے لیے جگہ خالی کرتا تھا جس کی سربراہی انگریز کے اختیار میں بھی ہے۔

یہ حقیقت انتہائی افسوس ناک ہے کہ اس شاعر کی زندگی اور اس کے عہد سے متعلق اطلاعات کے ایک بیش بہا خزانے سے بہاری قسطیں محروم ہو چکی ہیں، تاہم دست بردوانانہ سے وہ ابتدائی خطوط بچ گئے ہیں جو ”بیج آہنگ“ کے پانچویں آہنگ میں شامل ہیں۔ ”بیج آہنگ“ غالب کی زندگی میں دوبار چھپی، لیکن وہ دونوں اشاعتوں سے نامطمئن تھے، پہلی اشاعت نامکمل تھی اور دوسری اغلط سے بُرا! ہر حال ”بیج آہنگ“ کے خطوط میں کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ ہوں، وہ آج بھی غالب کی ابتدائی زندگی کا بنیادی ماخذ ہیں، اور اس دور کے ان مشاہیر کا تعارف بھی، جن سے غالب کی ۱۸۵۷ء سے پہلے خط و کتابت ہوا کرتی تھی۔

”بیج آہنگ“ کے خطوط کا یہ اختیار زمان و مکان ایک وسیع تناظر ہے لیکن وہ خطوط جو بعد میں دریافت ہونے اور مختلف تنقیدی اشاعتوں میں بھی شامل ہوئے، صرف غالب کے قیام گلشن سے متعلق ہیں۔ ان مجموعوں میں سے سب سے پہلا جو لکھنؤ میں دریافت ہوا، ان ارمیا لیس فارسی خطوں پر مشتمل ہے جو انھوں نے مولوی سرراج الدین، مرزا احمد بیگ خان اور مرزا ابوالقاسم خان کو، جن سے ان کی گلشن کے قیام کے دوران دوستی ہو گئی تھی، لکھے۔ یہ خط و کتابت ان کی دلی وابستگی پر بھی قائم رہی۔ ان خطوط میں سے اکثر ”بیج آہنگ“ میں شامل ہیں لیکن ان خطوط کی حدود و قیمت اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ اس سے پہلے کی اشاعتوں کی اغلط کی تصحیح کرتے ہیں۔ یہ خطوط غالب کی چند غزلیات کے ساتھ ”مستقرات غالب“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

اتنا ہی اہم انھیں فارسی خطوط کا ایک دوسرا مجموعہ ہے۔ جس کی دریافت ڈھاکہ کے حکیم حبیب الرحمن کے ذاتی کاغذات سے ہوئی ہے۔ یہ خطوط غالب نے اپنے گلشن کے دوستوں کو لکھے تھے۔ اگرچہ مکتوب الیم کے نام آج بھی دریافت نہیں ہو سکے، تاہم غالب خیال یہ ہے کہ ان میں مرزا احمد بیگ میاں، خواجہ محمد حسن اور فیض الدین چندر شامل ہیں۔

یہ خطوط بھی "تاثیر غالب" کے عنوان کے تحت غالب کے حلیہ مطبوعہ کلام کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔

"مستقرات غالب" اور "تاثیر غالب" کے خطوط ہی کی ایک اور کڑی، غالب کے قیام کلکتہ پر جنسی، فارسی کے وہ خطوط ہیں جو ایک بے مثل و یک نام خطوط کی شکل میں دست باب ہوئے ہیں اور "نیشنل آرکائیوز"، نئی دہلی، میں محفوظ ہیں۔

### (۳)

اس مجموعے کا اصل خطوط "نیشنل آرکائیوز آف انڈیا" نے ۱۹۶۰ء میں کڑا کے سینہ صدر رفیع نقوی سے حاصل کیا تھا۔ کڑا صوبہ آئرلینڈ کے ضلع اہ آپلو کا وہ تاریخی حصہ ہے جس سے منشی سید علی حسن خان کا بھی تعلق تھا جنہوں نے ان خطوط کو خطوط کے آخر میں انگریزی تحریر کے مطابق اصل سے نقل کیا ہے۔ اس امر کا تا حال تعین نہیں ہو سکا ہے کہ اس مجموعے کی تدوین کس زمانے میں ہوئی۔ اسیبا اس کی نقل ۱۸۳۹ء کے ارد گرد ہوئی ہے اور یہ بات پر گنہ بدوسا\* اور کالنبر\*\* ضلع باندہ کے تحصیل دار سید افضل علی کے ۵ اگست ۱۸۳۹ء کے اس خط سے معلوم ہوئی ہے جو انہوں نے منشی سید علی حسن خان کو ان کے باندہ سے کے پتے پر بھیجا تھا۔ اگرچہ منشی سید علی حسن خان کے بارے میں بھی کوئی معلومات نہیں، لیکن بدوسا اور کالنبر کے تحصیل دار نے جس احترام اور عزت سے انہیں مخاطب کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ باندہ سے کی استکسار میں منشی سید علی حسن خان ایک بلند مرتبہ رکھتے تھے اور قریبی قیاس یہی ہے کہ یہ سارے خطوط وہیں پر نقل کیے گئے۔ اس مفروضے کو اس امر سے مزید تصدیق ملتی ہے کہ ان خطوط میں سے اکثر خطوط مولوی محمد علی خان کو بھیجے گئے تھے جو باندہ سے میں صدر امین، یعنی سول جج کے عہد سے پر مشغول تھے۔

\* ضلع باندہ کی ایک تحصیل۔

\*\* تحصیل گروان ضلع باندہ کا مشہور پہاڑی حصہ اور قصبہ۔

زیر نظر خطوط ۳۳ اوراق پر مشتمل ہے، جب کہ ایک صفحے پر ۷۰۰ قطع کی ہے۔  
 سطریں ہیں۔ یہ کل ۳۳ خطوط ہیں جن میں سے ۳۲ غالب کے ہیں۔ ان میں سے دو خطوط  
 ایسے ہیں جو قسطنطنیہ میں حسی خان کو ان کے دوستوں نے لکھے ہیں۔ ان ۳۲ خطوط کے علاوہ،  
 جن میں خط نمبر ۵ خط نمبر ۲ کی نقل ہے، خطوط میں دو شمارے بھی موجود ہیں، جن کا  
 تعلق اس اونی کاڈ آرائی سے ہے جو غالب کو گلشن میں درپیش تھی۔ یہ داستان اس مجموعے  
 کے نمبروں (نمبر ۱ اور نمبر ۲) میں شامل ہے۔ خطوط خط گلشن میں سیاہ روشنائی سے ہاتھ کے  
 بے کاغذ پر ہے اور بہت سی جگہوں پر کرم خوردہ ہے، نتیجتاً ان جگہوں پر عبارت کو "تلفیات"  
 "نثر غالب" اور "تلفیات غالب" کی مدد سے پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں ان کتابوں  
 سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکی، وہاں قوسین میں میں نے اپنے قیاس سے حانہ پر ہی کی ہے اور  
 جہاں اس میں بھی ناکامی ہوئی، وہاں نقطے لگا کر کرم خوردہ جگہ کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔  
 ستم یہ ہے کہ خطوط فقط کرم خوردہ ہی نہیں، بلکہ کئی خطوط پر کوئی تاریخ نہیں۔ جن خطوط پر  
 تاریخ تحریر ہے، ان پر سال رقم نہیں لکھا گیا۔ مزید یہ کہ ان خطوط کو کسی خاص تسلسل سے  
 مرتب نہیں کیا گیا۔ نتیجتاً ان کا مطالعہ قاری کو حیران و پریشان کر دیتا ہے۔ میں نے خطوط  
 کے اندرونی شواہد کی بنا پر اور چارمنوں اور دونوں کا موازنہ کر کے انہیں زمانی تسلسل سے  
 ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ ہر خط کے شروع میں ایک لکیر کے اوپر اور نیچے دو ہندسے  
 درج کیے ہیں اوپر والا ہندسہ زیر نظر مجموعے میں متعلقہ خط کا نمبر شمار ہے، جب کہ نیچے کا  
 ہندسہ خط کے نمبر شمار ہے۔ نیچے کا ہندسوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خطوط میں خلوں کی  
 ترتیب کیا ہے۔

ان خطوط میں ناقص تسلسل زمانی ہی نہیں، بلکہ مکتوب الیم کے نام بھی نہیں ہیں،  
 سوائے خط نمبر ۳۱ کے، جہاں مکتوب الیم کا نام "نواب علی اکبر خان آف بگلی" لکھا ہے۔  
 یہی خط تصویر میں تبدیلی کے ساتھ "منج آہنگ" کے شروع میں موجود ہے۔ اسی طرح سات  
 دوسرے خطوط بھی اس مجموعے اور "منج آہنگ" میں مشترک ہیں۔ اگرچہ ان سات خطوط کی  
 عبارت میں اختلاف ہے تاہم "منج آہنگ" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مکتوب الیم باندے

کے مولوی محمد علی خان ہیں۔ اس علمی و تحقیقی سے سراخ لے کر میں نے خطوط کے متن کو غور سے پڑھا اور ہر ذرہ اندر و فی شواہد کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچا کہ باقی ۳۱ خطوط میں سے ۲۷ باندے کے مولوی محمد علی خان کو اور ایک جگہ کے نواب سید علی اکبر خان طہاٹائی کو لکھا گیا ہے، جب کہ باقی دو خطوط کے مکتوب الیم سے متعلق نہیں ہو سکتے۔

### (۳)

مکتوبہ بالا دو مکتوب الیم میں سے ایک، یعنی مولوی محمد علی خان قصبہ موہان، ضلع اٹک، آٹرو پویش، کے رہنے والے اور سراخ الدین علی خان کے، جو کلکتہ میں قاضی القضاات یعنی صدر عدالت میں چیف قاضی تھے، چھوٹے بھائی تھے۔ محمد علی خان ہندوستان میں انگریزی عمل داری میں مفتی، یعنی قانونی اسٹافی کے خارج کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اس کے بعد وہ ترقی کر کے باندے کے صدر امین، یعنی سول جج بن گئے۔ وہ اسی عہدے پر مامور تھے، جب غالب ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں باندے سے ہوتے ہوئے کلکتہ گئے۔ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عہدے پر ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۴۱-۴۲ء تک فائز رہے، جب باندے میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ بھی شاعری کرتے تھے اور فارسی میں بغیر کسی نقص کے شعر کہتے تھے۔

نواب سید علی خان طہاٹائی غلام حسین خان طہاٹائی کے، جو مغلوں کے دورِ آخر کی مشہور و معروف تاریخ ”بستر المناظرین“ کے مصنف ہیں، بھتیجے تھے۔ انھیں بورڈ آف ریونیو اور گلکٹر جگہ نے ۱۸۱۰ء کے مابعد نمبر ۱۹ کے تحت جگہ کے مشورہ نام ہاؤس سے منسلک جاگیر کے انتظام کے لیے بطور امین اور حاضنی منتظم مامور کیا تھا۔ آخر یا نوامہ بعد گلکٹر جیسو کے حکم سے یہ وقت دو بارہ ۹ جولائی ۱۸۱۶ء کو مستویانِ سابق باقر علی خان اور واثق علی خان عرف مثل جان کی تحویل میں دے دیا گیا۔ مستویانِ مذکور نے قرض لے کر حکومت کے واجبات لوا کر دیے اور پورے دو سال تک اس وقت کا انتظام سنبھالا، لیکن ستمبر ۱۸۱۸ء میں بورڈ آف ریونیو نے انھیں ہٹا کر امام ہاؤس کے وقت کا انتظام سید علی اکبر خان کے



حوالے کر دیا۔ اسی اثنا میں باقر خان قاتراصل ہو گئے اور ان کے ہم کار والحق علی خان نے وقت کی بازیابی کی دوبارہ کوشش کی، لیکن انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے بعد وہ کئی سال تک وقت کے منہ سے میں الجھے رہے اور حکومت کے خلاف اپنے دعوے کی پیروی کرتے رہے۔ آخر کار اس منہ سے کا فیصلہ دہلی سے اسٹریٹ نے، جو بجلی کا بیج تھا، ان کے خلاف کر دیا اور اس فیصلے پر دہلی کی کونسل کی مہر تصدیق بھی ثبت ہو گئی۔

سر چارلس مشاف کے زیرِ انتظام وقت جاگیر کی آمدنی بستر مقاصد کے لیے صرف کی جاتی تھی، مثلاً بجلی کوئلے کا قیام (تاریخ یکم اگست ۱۸۳۶ء)، ہسپتال، مسافر خانہ، غلہ وغیرہ۔ یہ تمام دفاہی ادارے سینڈ علی اکبر خان کے زیرِ انتظام قائم کیے گئے تھے، جنہیں حکومت کے حکم کے مطابق ۱۸۳۱ء میں سونپ کر دیا گیا۔ ان امور سے ثابت ہوتا ہے کہ علی اکبر خان اپنے زمانے کی ہارسوخ و ہاثر شخصیت تھے، اس لیے غالب نے گلشنہ پہنچنے سے پیش تر ہی ہاندے کے مولوی محمد علی خان سے ان کے نام ایک خط لے لیا تھا۔ جب گلشنہ پہنچنے کے فوراً بعد وہ سینڈ علی اکبر خان سے ملنے بجلی گئے تو وہ خط لے کر گئے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے محمد علی خان کو ہاندے میں اپنے خطوط سے مطلع کیا، وہ ان کی ہمت و برداشت، طور طریق اور لوب آداب سے نہایت متاثر ہوئے تھے۔

## (۵)

لوہر بیان ہو چکا ہے کہ غالب نے گلشنے کا یہ دشوار سفر اس ناانصافی کے ازالے کے لیے اختیار کیا تھا جو احمد بخش خان نے ان سے روا رکھی تھی۔ اس سفر کا مقصد اس خاندانی ہمیش کی وراثت پر، جو ان کے مرحوم بچا نصر اللہ بیگ خان نے چھوڑی تھی، اپنا حق منوانا تھا۔ ان کا دھوا تھا کہ ان کے مرحوم بچا کو چار سو سواروں کی رسال داری، مع سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ، اور سو گھوڑے اور سو گھوڑے دو پرگنوں کی جاگیر کے، جو ان کی خدمات کے اعتراف میں، بمطابق پروانہ ۲۱ اور ۲۶، سال ۱۸۰۵ء میں عطا ہوئے تھے، ملی تھی۔ یہ پرگنے انھیں

تاصیحات حیات بندوبست استراری کے تحت پندرہ ہزار آٹھ سو روپے مالیے کے عوض ملے تھے، جب کہ اس جاگیر کی کل سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپے سے زائد تھی۔ اس جاگیر پر ماسوہ ہونے کے دس گیارہ مہینے بعد ہی نصر اللہ بیگ خان ہاتھی سے گر کر زخمی ہوئے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی موت پر حکومت نے جاگیر ضبط کر لی اور چار سو سواروں کا رسالہ بھی تشکیل کر دیا۔

نصر اللہ بیگ خان لالہ مرے۔ ان کے ورثا میں صرف مندرجہ ذیل اشخاص تھے:

(۱) شاعر احمد اللہ خان غالب۔

(۲) ان کے بھائی مرزا یوسف جو ان سے دو سال چھوٹے تھے۔

(۳) ان کی دہوی، یعنی نصر اللہ بیگ خان کی والدہ۔

(۴) ان کی بیوی چھوہیاں، یعنی نصر اللہ بیگ خان کی بہنیں۔ ان تمام لوگوں میں سے کوئی اس لائق نہیں تھا کہ لارڈ کیم کے پاس جا کر اپنے حق کی پیروی کرنا، کہیں کہ نصر اللہ بیگ خان کے ایسے نے انہیں غم سے نڈھال کر دیا تھا، پھر یہ کہ افروز زہرا میں احمد اللہ خان غالب صرف نو سال کے تھے اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف سات سال کے۔ حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خواجہ حاجی، جو ان کے خاندان کے پوروں گان میں سے تھا، رسالے کی ساری باقیات، از قسح سواری و چاکر و خیمہ و خرگاہ، اپنے قبضے میں لے کر نصر اللہ بیگ خان کے خسر احمد بخش خان سے مل گیا۔ احمد بخش خان نے اس ہدر ہاتھی گھوڑے سوار مال و اسباب کو اپنی جاگیر کے لیے طاقت کا ذریعہ سمجھا اور خواجہ حاجی کو مسترد طاقت پر بٹالیا۔

اس وقت احمد بخش خان مستقل طور پر محلات فیروز پور اور جمرکا، ساونگرس، پوناہانا، نو جورو اور گکینے پر بعض بیس یا تیس ہزار روپے سالانہ قابض تھے۔ خواجہ حاجی کو اپنی جاگیر پر بطور محافظ چھوڑ کر احمد بخش خان خود لارڈ کیم کے پاس کان پور چلے گئے اور درخواست کی کہ وہ بیس بیس ہزار روپے کے واجبات کی رقم اس پر صاف کر کے نصر اللہ بیگ خان کے پس ماندگان کی مدد پر حصص کر دی جائے۔ اس شرط کے ساتھ کہ اس سواروں کا رکھنا بھی ان کے ذمے ہو گا۔ اور وہ حکومت کے افسار سے پر حاضری کے پابند ہوں گے۔ لارڈ کیم نے اس تجویز پر صاف کر دیا اور اس مسنون کی ایک رپورٹ ہارنچیلڈ و ہارلوک، جو لگتے ہیں اس وقت

قائم مقام گورنر جنرل تھا، بھبھوادی۔ چنانچہ بتاریخ ۱۳ صفر ۱۲۲۱ھ مطابق ۳ مئی ۱۸۰۶ء ایک پروانہ احمد بخش خان کے نام جاری کیا گیا جس کی رو سے مذکورہ حالات کے واجبات سے انھیں معافی دے کر ان کو خواجہ حاجی نور نصرت بیگ خان کو ورثا کی کفالت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی ہوا کہ وہ حکومت کو وقت ضرورت یہاں سواروں کا دستہ مینا کریں گے اور ان کے ذمہ دار بھی ہوں گے۔ مندرجہ بالا پروانہ کے اجرا کو ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ۱۹ ربیع الاول ۱۲۲۱ھ مطابق ۷ جون ۱۸۰۶ء احمد بخش خان نے لارڈ کیک سے ایک اور پروانہ حاصل کر لیا جس کی رو سے نصرت بیگ خان کے خاندان کی پیشین مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم ہونا قرار پائی:

- ۱۔ خواجہ حاجی ۶۰۰۰ روپے
  - ۲۔ نصرت بیگ خان کی والدہ اور بہنیں ۱۵۰۰ روپے
  - ۳۔ مرزا نوشہ (عالم) اور مرزا یوسف (مرزا نصرت بیگ کے بیٹے) ۱۵۰۰ روپے
- 
- ۵۰۰۰ روپے

جب عالم سب شعور کو پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ احمد بخش خان نے ان کے خاندان کے ساتھ کیا نا انصافی کی ہے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ نصرت بیگ خان کے ورثا کی پیشین میں خواجہ حاجی کو کسی قسم کی شراکت کا استحقاق نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے دادا کے زمانے میں ایک نوجوان خواجہ مرزا نام کا تھا جو بطور سائیس کے ان کے گھر پانچ روپے ماہ واد پر ملازم تھا۔ اس خواجہ مرزا کی شادی ان کی دلدی کی بیوہ بہن کی ایک لڑکی سے ہو گئی۔ ان کی دلدی ان لوگوں کی کفالت بھی خاندان کے دوسرے افراد کی طرح کرتی رہیں۔ اس شادی کا نتیجہ خواجہ حاجی تھا جس کا، ظاہر ہے، نصرت بیگ خان کی پیشین پر کوئی استحقاق نہیں تھا۔

عالم چاہتے تھے کہ احمد بخش خان سے بالادہ چارہ جوتی کریں، لیکن یہ امر، کہ خود ان کے اپنے خسر مرزا الہی بخش خان ان احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی تھے اور اس سے ان کی ندر اسگی کا اندیشہ تھا، مانع آیا۔ مزید یہ کہ احمد بخش خان مسلسل عالم کو بھین دلائے رہے

تھے کہ خواجہ حاجی کا حصہ اس کی موت پر خود بخود ختم ہو جائے گا۔ لیکن احمد بخش خان نے وعدہ دیا نہیں کیا۔ نتیجتاً جب ۱۸۲۵ء میں خواجہ حاجی کا انتقال ہوا تو اس کا حصہ اس کے بیٹوں کو تقویض ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کو مارٹر جنرل لاجپت ہو گیا تھا اور غالب کو اس کی تیمارداری کے لیے چھ سو روپے سالانہ اور اس کے قرض خواہوں کے لیے نو سو روپے سالانہ کا زیر بار ہونا پڑا تھا۔

جب مصائب کا یہ سلسلہ بدیز ہو گیا تو غالب بیس بدل کر دو یا تین، نوکروں کو لے کر گھوڑے کی پیش قدمی پر فیروز پور بھر کر روانہ ہوئے کہ احمد بخش خان کے وعدوں کی تصدیق کی جائے۔ وہ وہاں ۱۶ جنوری ۱۸۲۶ء تک، کہ جب بھرت پور کو سرہاٹس مشاف نے تعمیر کر لیا، قیام پذیر رہے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ احمد بخش اس بات کو کسی نہ کسی بہانے مسئلہ ٹال رہے ہیں تو انھوں نے مشاف سے مل کر دو خواہی کی کوشش کی۔ غالب اپنے قرض خواہوں کی ہمدردی آرائی اور ان کے شور و غوغا سے ڈر کر دہلی نہ جانے کے اور مشاف سے ملاقات کے لیے انھوں نے کان پور کا رخ کیا۔

کان پور پہنچتے ہی وہ شدید بیمار ہو گئے اور جہاں کہ انھیں وہاں کوئی معقول سٹاپ نہیں مل سکا، وہ کرائے کا پانگنی پر گھٹا پارک کے کھسوٹے پر جم کر رہ گئے۔ کھسوٹ کی آہ و بواہی انھیں راس نہ آتی اور وہ وہاں پانچ ماہ سے اوپر صاحب فراش رہے۔ اس کے بعد وہ باندے روانہ ہو گئے جہاں انھوں نے نواب ذوالفقار علی کے پاس قیام کیا۔ نواب ذوالفقار علی اپنے بڑے بھائی شمشیر سادری کی موت پر ۳۱ اگست ۱۸۲۲ء کو باندے کے نواب بنے تھے۔ جو توجہ اور صحت تیمارداری غالب کو باندے میں دینا آتی اس نے انھیں مرض سے کھلی شفا یاب کر دیا اور غالب نے باندے میں چھ ماہ تک ان کی میزبانی کا لطف اٹایا۔ اس وقت تک جہاں کہ برسات کا موسم ختم ہو چکا تھا اور گورنر جنرل بھی گلشنے واپس آ چکا تھا، غالب نے یہ سوچتے ہوئے کہ وہی نور گلشنے میں ایک ہی قانون کی عمل داری ہے، ہنگام کی جانب حرکت کی۔ جب وہ مرشد آباد پہنچے تو انھیں نواب احمد بخش خان کی موت کی اطلاع ملی، جو رنج اللہ علی ۱۲۳۳ھ مطابق ستمبر اکتوبر ۱۸۲۷ء میں واقع ہوئی تھی۔ غالب کے لیے اس واقعے کی

چند اہمیت نہ تھی۔ ان کا دعوایہ احمد بخش خان کی جاگیر سے متعلق تھا، ان کی موت یا زندہ رہنے سے اس دعوے پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا، لہذا انھوں نے مشرق کی جانب لہنا سفر جاری رکھا تا آنکہ وہ مرحلہ آباد سے لگنے پہنچ گئے جو ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر مقام تھا۔

## (۶)

غالب کے ان انکبیس خطوط میں سے، جن کا خلاصہ انکی سطور میں دیا جا رہا ہے، پہلے خط میں صنعتِ تعطیل میں وہ ایسے شر پارے ہیں، جنہیں نثر میں شاعری کہا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں شر پارے مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں پہلا تو مولوی فضل حق سے بغیر ملاقات کیے احمد بخش خان کی جاگیر فیروز پور کے لیے روانہ ہو جانے کا سوزت نامہ ہے۔ احمد بخش خان ان دنوں چھوٹی چھوٹی رکابتوں اور بدلو توں میں گھر جانے اور ریاست اللور سے اپنے واجبات کی عدم تفصیل کی بنا پر سخت مصیبت میں گرفتار تھے۔ دوسرا شر پارہ ایک عرض داشت ہے، جو ۲ مرم ۱۲۳۲ھ، مطابق ۵ اگست ۱۸۲۶ء، کو سبحان علی خان اور میر نیاز حسین خان کے ایما پر، بہ سبب غالب کی ان سے لکھنؤ میں دوستی ہو جانے کے، مستند اللور عرف آغا میر کے نام، جو اس وقت اودھ کے نائب السلطنت تھے، لکھی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ غالب نے آغا میر کی مدح میں ۱۱۰ اشعار پر مبنی ایک قصیدہ بھی کہا ہے۔ غالب اور آغا میر کے درمیان ایک ملاقات کی تجویز بھی تھی لیکن وہ پذیرائی و پیشوائی کا نازک مسئلہ مل نہ ہو سکے کے باعث صورت پذیر نہ ہو سکی اور نتیجتاً وہ شر پارہ اور دوسرے قصیدہ پیش نہیں کیے جا سکے اور غالب نے طیش کے عالم میں لکھنؤ کو خیر باد کہا۔

لکھنؤ سے وہ ہاندے گئے جہاں مولوی محمد علی خان سے، جو وہاں صدر امین تھے، ان کی ملاقات ہوئی۔ ہاندے کے قیام کے دوران ان کے حار نے میں ہدرے لگا دیا گیا لیکن عام گفتگویت بہ ستور جاری رہی۔ یہاں انھوں نے ایک لڑکیا (بیل گاڑی) کرائے پر لی اور مودھا

سے ہوتے ہوئے چڑھتا رہا۔ لڑکیاں اتنی آہستہ چلتی تھیں کہ وہ سوچا اور ہنستا، کے درمیان ۲۳ میل کا راستہ ایک دن میں طے نہ کر سکی۔ بھدرا غالب کو سردار ایک گاؤں میں رات گزارنی پڑی۔ وہ سرسے دن علی الصباح گھوڑے پر سوار ہوئے اور دوپہر تک چڑھتا رہا کی سرسے میں پہنچے۔ یہاں جب وہ لڑکیاں کا انتظار کر رہے تھے تو طوفان کا طعنے دار نظر آیا۔ غالب نے چاہا کہ وہ تھوڑی خط، جو مرزا منٹو نے ملتی صاحب کے نام دیا ہے، اُس کے حوالے کریں لیکن اس نے یہ دستوری قبول کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ انھوں نے یہ خدمت کسی اور کے سپرد کی جس نے اس کے لیے آمادگی کا اظہار کیا اس اثنا میں رات پڑے لڑکیاں بھی سرسے میں پہنچ گئی۔ لڑکیاں کے سفر سے تنگ ہو کر انھوں نے ایک کشتی کرائے پر لی اور اس میں اپنے نوکر، گھوڑا، سداں لاد کر جانا کے راستے حازم لہ آباد ہو گئے (خطوط، ۲ اور ۳)۔

لہ آباد پہنچتے ہی ان کی طبیعت زیادہ قریب ہو گئی پھر وہاں مناسب لوہے ملی سکیں نہ اور ذوق کی صحت، جو ہمیشہ غالب کی زندگی کی بڑی ضرورت رہی تھی۔ چنانچہ وہ لہ آباد سے ایسے مختصر ہوئے کہ انھوں نے اس شہر کو "دوزخ برنوسے زمین" اور "فلوت خانہ شہا طیبی" کا نام دیا۔ جن کو سداں اٹھانے کے لیے انھیں وہاں کوئی قلع نہیں مل سکا، بھدرا ایک دن وہاں قیام کرنا پڑا۔ وہ سرسے دن انھوں نے ایک بھلی کرائے پر لی اور بنارس کی طرف پیش قدمی کی۔

بنارس میں وہ پانچ دن تک سرسے خیرنگ آباد میں، جس کو عام طور پر "نورنگ آباد" کہتے ہیں، قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد انھوں نے میاں رمضان اور میاں کی حویلی میں گو سی خانہ ملاں کی حویلی سے ملحقہ اور سرسے نورنگ آباد کے قصبے میں ایک مکان کرائے پر لیا۔ اس شہر کی صورت میں غالب کو اپنا دل پسند عروس البلو نظر آیا۔ خوش گو اور آب و ہوا اور دل کش مناظر نے انھیں مکمل طور پر صحت مند کر دیا اور ان کی طبیعت کی بے تابست بحال ہو گئی۔ شہر کی زندہ دلی سے مسرور اور ہری چہرہ مسکونوں سے متاثر ہوئے۔ مندر کی گھنٹیوں نے تو غالب کو بدست کر دیا۔ یہ فضا تھی جس میں غالب نے اپنی انسانی سرانگیزی شنوئی کھئی، جس میں بنارس کو "جنت الفردوس" اور "کعبہ جنت" قرار دیا۔ بنارس میں چار ہفتے قیام کے بعد

بہت دل گیر ہو کر سرگ کے راستہ وہ عظیم آباد (پٹنہ) کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں سے وہ گلشن گئے جہاں وہ قبلہ دوسرے درجہ (۱) کے روز ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۰ فروری ۱۸۲۸ء کو پہنچے (خطوط: ۳ اور ۵)۔

گلشن پہنچتے ہی غالب کو بغیر کسی دقت کے پھر روپے ماہ وار پر (۲) میر احمد کی حوٹلی (۳) میں گول تالاب (۴) کے قریب ہمت اسٹریٹ شملہ بازار میں ایک مکان کرائے پر مل گیا۔ مکان بڑا کٹاوا تھا۔ اس میں ایک بڑا بیت اللہ تھا اور صحن میں بیٹھے پانی کا ایک کنواں بھی۔ یہاں پہنچ کر غالب کو یہ خیال آیا کہ وہ قصیدہ، جو انھوں نے اسٹوڈنٹس کے آغا میر کے لیے لکھا تھا، مرشد آباد کے نواب بہاؤیوں ہاؤ کو پیش کر دیا جائے (۵)۔ دو دن سنانے کے بعد غالب بانہ سے کے مولوی محمد علی خان کا تھوڑی خط لے کر کشتی کے ذریعے نواب علی اکبر خان ملہاٹھانی سے ملنے بجلی گئے، جہاں ان کی گرم جوشی سے پذیرائی ہوئی اور دو گھنٹے تک گفت گو رہی، پھر غالب گلشن آ گئے، لیکن پھر چند دن بعد ہی بجلی دوبارہ گئے اور نواب علی اکبر خان ملہاٹھانی کے پاس دو دن اور ایک رات گزار دی اور اپنے مقصد سے کے حقائق سے بھی آگاہ کیا۔ شوی قسمت نواب ملہاٹھانی ان دنوں بجلی کے گلشن کے ساتھ لام ہاؤس کی ہاگیر کی قبول پر خود بھی ایک مقدمے میں الجھے ہوئے تھے۔ (۶)

(۱) خطوط اور کلیات نثر میں ”سنگی کاؤں“ لکھا ہے جو اس تاریخ سے مطابقت نہیں کرتا۔

(۲) کلیات نثر کے مطابق، ”دس روپے ماہ وار۔“

(۳) کلیات نثر میں اس کا نام ”حوٹلی مرزا علی سوداگر“ دیا گیا ہے۔

(۴) کلیات نثر میں ”گول تالاب“ کی جگہ ”گول تالاب“ لکھا گیا ہے۔

(۵) یہ ارادہ قمر مندہ تکمیل نہ ہو سکا اور غالب نے اس قصیدے کو لکھنے کے قصیر الدین حیدر کے نام کر دیا۔

(۶) پرانا امام ہاؤس ۷۷ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ نیا امام ہاؤس کراست علی نے بنوایا تھا۔

۱۸۸۳ء میں جب حاجی محمد حسن اللہ استمال کر گئے ان کی جائیداد، جس کی آمدنی ہر سال پانچ سو روپے ملتی تھی، کا ذخیرہ کے لیے وقف تھی۔ یہ مقدمے بازی اسی جائیداد کے سلیٹے میں طویل عرصے تک چلی۔

علی اکبر خان طباطبائی سے حالات کے فوراً بعد ہاندے کے مولوی محمد علی خان کی ہدایت کے مطابق مرحوم کا فی الصلوات کی قبر پر گئے۔ مرحوم کی بیوہ کے لیے ایک عمارتی رکھے کے ساتھ غالب نے ان سے انخالی\* میں لن کی قیام گاہ پر ۲۰ رمضان ۱۲۳۳ھ مطابق ۶ اپریل ۱۸۴۸ء کو حالات کی۔ یہاں مولوی حکام علی نے بیگم سے غالب کا مصارف کرایا اور بیگم بد کوہ نے برسی گرم جوشی سے پردے کے چپے سے غالب سے بات چیت کی۔ بیگم نے غالب سے کہا کہ شملہ بازار شہر سے بہت دور ہے، اس لیے اپنے جانے مولوی ولایت حسن کے دورے سے واپس آ جانے پر میں آپ کی رہائش کا انتظام اپنے گھر ہی میں کرا دوں گی (مخطوطہ ۶۰ اور ۸)۔

انخالی جانے کے ایک ہفتے بعد ہی ۲۷ رمضان ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۳ اپریل ۱۸۴۸ء کو غالب کو اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کے خط کے ذریعے، جنہیں وہ حالت جنونی میں گنڈے سمویڈوں سے علاج کراتے چھوڑ آئے تھے، یہ اطلاع ملی کہ حامل نے ان پر کالے جادو کی تحریک کی ہے اور نئے علاج سے ان کی حالت میں تصدیق شدہ المصائب کے مطابق حیرت انگیز افادہ ہوا۔ حالات کی اس تبدیلی نے غالب کو انتہائی خوش کروا (خط ۶۰)۔

ایک اور بد مسرت خیر غالب کی منتظر تھی۔ ۱۳ شوال ۱۲۳۳ھ مطابق ۲۸ اپریل ۱۸۴۸ء کو غالب نے مسٹر فریزر کے نام فارسی میں ایک عرض داشت لکھی، جس میں وہ وجوہات بیان کیں جن کے سبب وہ اپنا عرضی و عویٰ براہ راست سپریم کو نسل میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ ان کے بعد انہوں نے پڑھیں سکرٹری مسٹر اسمٹنگ سے، جنہوں نے فارسی لوب میں بڑا اچھا ذوق حاصل کیا تھا، حالات کی۔ انہوں نے غالب کے ان بد حیرت افادہ کو، جو ان کے لیے لکھے گئے تھے، بہت پسند کیا (خط ۸)۔ اس کے بعد غالب نے مسٹر فریزر کے دوبارہ دست پر دستک دی جہاں ان کی برسی اچھی طرح پذیرائی ہوئی اور فریزر کو یہ سن کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ غالب نصر اللہ بیگ خان کے نتیجے میں جنہیں وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ اس

\* انخالی، لکھنے کا وہ مشورہ اور وسیع رہائشی علاقہ جس میں سرکوں اور گلیوں کا جال بچا ہوا



کے بعد غالب نے اپنی مرض داشت، جو انھوں نے خود داری میں لکھی تھی، انھیں پیش کی تاکہ گورنر جنرل مسٹر ہیلی کو پیش کر دی جائے۔ مرض داشت کے داخل ہو جانے پر مسٹر فریز نے اسے مسٹر نیشن کے پاس بھیج دیا، جہاں کا کام اس قسم کے مرضی دعووں کا داری سے انگریزی میں ترجمہ کرنا اور فریز کو پیش کرنا تھا۔ ہاروں ٹھوٹ مٹھتی ہو کر غالب نے فریز سے رخصت چاہی۔ چلتے ہوئے فریز نے انھیں نہ صرف صبر اور پائپ پیش کیے، بلکہ مشابعت کے لیے دروازے تک بھی آیا۔ اس کا غالب کے ذہن پر بڑا اچھا اثر پڑا اور انھیں اپنے مقدمے کے فیصلے سے برمی امیدیں وابستہ ہو گئیں۔

اسی دوران غالب کو علم ہوا کہ مرزا افضل بیگ، جو گلشن میں اکبر ٹائی کا وکیل تھا، ان کے خلاف ایک باقاعدہ مہم چلا رہا ہے۔ افضل بیگ خواجہ حاجی مرحوم کا سالار تھا اور اس لیے، ظاہر ہے، اس کی ساری ہم دویاں اپنے جانوں کے ساتھ تھیں جو اس پیشی کے مقدمے میں باقاعدہ ایک فریق تھے (خط ۸)۔

غالب کے دروہ گلشن سے گھر سے پیش تری مرزا افضل بیگ اور اس کے چند ہواخواہوں نے، جنھیں سرکاری مکتوں میں کافی رسوخ حاصل تھا، یہ خبر مشورہ کر دی تھی کہ نووارد موصوف کو اپنا تقصیر بدلنے کی طاقت ہے اور ایسا وہ اکثر لوقات کرتے رہتے ہیں۔ غالب نے یہ الزام لہنا اردو کا دیوان، جو سات سال سے زیادہ عرصہ پہلے مرتب کیا تھا، پیش کر کے غلط ثابت کر دیا۔\* اس دیوان پر جو ہر ثبت تھی اس پر "اسد اللہ خان عرف مرزا نوہ" اور سنہ ۱۳۳۱ھ (مطابق ۱۶-۱۸۱۵ء) کندہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے حکومت کے سیکرٹری کو ایک درخواست بھجوائی اور اس غلط الفواد کو اپنے بد خواہوں سے منسوب کر کے اس حقیقت کی وضاحت کی کہ اسد اللہ خان ان کا نام، مرزا نوہ ان کی حرفیت اور غالب ان کا تقصیر ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ غالب چار حرفی لفظ ہونے کے سبب چوں کہ بعض

\* اردو دیوان: اس کا مطلب ہے کہ اس کی تالیف ۱۸۲۰ء میں ہوئی تھی اور اس پر یہ شہادت صادق آتی ہے کہ غالب کے سب سے پہلے دیوان کی کتابت، جو "نورِ حمید" کے نام سے چھاپا جاتا ہے، ۱۸۲۱ء میں ہوئی تھی۔

مردوں میں وزن پر نہیں آتا اس لیے کبھی کبھی وہ اسد بھی بطور تخلص استعمال کر لیتے ہیں، جس میں صرف تین حروف ہیں اور جو ان کے نام کا ایک حصہ ہے (ضمیر ii)۔

حکومت کے کارکنوں کے ذہنوں کو متاثر کرنے کے علاوہ مرزا افضل بیگ نے گلشن کے ادبی اور مذہبی حلقوں میں بھی غالب کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ سنیوں میں بتایا کہ غالب رافضی ہے اور شیعوں میں کہا کہ لادینی ہے۔ اس نے اسی پر انکشاف نہیں کیا، بلکہ گلشن کے شعرا کو چیلنج دیا کہ غالب تمہیں کسی شہرہ ہی میں نہیں لٹاتا، بلکہ قتیل کی تو اس نے برسرِ مظلِ مدنت کی ہے۔ اس طرح وہ گلشن کے ان شعرا کو، جو قتیل کے حامیوں میں سے تھے، برا لگینے کرنے میں کامیاب ہو گیا (خط: ۸، ضمیر ii)۔

اسی اثناء میں گلشن کے شعرا نے ایک ادبی فائیم کی کہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے اقوال کو "گلشنِ مدر" میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ ایک ایسی فست اقوال ۱۷ ذیقعد ۱۲۳۳ھ مطابق یکم جون ۱۸۲۸ء کو منعقد ہوئی جس میں غالب بھی شریک ہوئے۔ آئندہ مشاعرے کے لیے دو مصرع ہائے طرح، ایک درختہ اور دوسرا فارسی کا، طے ہوئے۔ اس میں غالب کو بھی مدعو کیا گیا۔ غالب نے اس مشاعرے کے لیے دونوں مصرعوں پر غزلیں کہیں اور سنائیں۔ سامعین میں اتفاق سے والی ہرات کا سفیر بھی موجود تھا، جس نے دوسرے شعرا کا قصور اڑایا لیکن غالب کے کلام کی بہت تعریف کی اور ان اشعار کو پاکیزہ فارسی کے بلند قیمت اشعار گردانا۔ اس بات نے دوسرے شعرا کو آتشِ حسد میں جلا دیا۔ اس حسد کے نتیجے میں انہوں نے غالب کے مندرجہ ذیل شعر پر زبان و بیان کے حوالے سے مختلف اعتراضات کیے:

جنتوں سے از عالم و از ہر عالم بیشم

ہمچو مٹوے کہ بھال را ز میاں بر خیزد

پہلا اعتراض یہ تھا کہ لفظ "ہم" اور "عالم" ایک ساتھ استعمال نہیں کیے جاسکتے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ لفظ "ہم" جمع ہے جب کہ "عالم" واحد ہے۔ "ہمارا ضربت" اور "نہر الفصاحت" میں اس استعمال کی سند نہیں۔ دوسرے یہ کہ لفظ "بیش" بغیر اپنے لاحقے "تر" کے استعمال

کرنا قواعد کے خلاف ہے۔ صحیح استعمال اس کا "پیش تر" ہے۔ تجسرا اعتراض یہ تھا کہ لفظ "برخیرو" کی جگہ زیادہ مناسب لفظ "زود" ہوتا۔ چوتھا اعتراض یہ تھا کہ شعرا نے کمر کے ساتھ "شو" کو "رستی" کے ساتھ استعمال کیا ہے "میں" کے ساتھ نہیں (خطوط: ۹۰ اور ۱۰، ضمیمہ ۲۱)۔ چھٹے تو غالب نے ان بے معنی اعتراضات کو کاغذی اعتبار ہی نہ گردانا تاہم بعد میں، یہ بتانے کے لیے کہ اصل حقیقت کیا ہے، انھوں نے اپنے مترضین کو جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس مشاعرے کی تیسری قسمت میں، جو ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۵ جون ۱۸۲۸ء، بروز اتوار منصف ہوئی، انھوں نے سعدی، حافظ، ظہوری اور ایسے ہی بعض دیگر چند شعرا کو بطور سند لہجی دلیل کے حق میں پیش کیا۔ سفیر ہرات نے غالب کی حمایت کی۔ مترضین اس وقت منتشر تو ہو گئے لیکن ان کے موقف میں مزید سختی آگئی۔ چنانچہ انھوں نے ایک دوسری غزل کے ایک شعر کو نشانہ اعتراض بنالیا۔

اشور اگلے یہ قطار نہی مرچاں دارم  
طنز بر بے سرو سامانی طوفاں زوداً

اعتراض یہ تھا کہ "طوفاں زود" میں کسرے کو مصافح کی ضرورت ہے۔ جب انھیں جواب دیا گیا کہ "زود" میں کسرہ اضافی یا سہ وحدت کی جگہ ہے تو انھوں نے کہا کہ "زود" کو حالت منفولی کے علاوہ کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ غالب نے اسامیہ کے کلام کو بطور سند پیش کرنے کی کوشش کی، لیکن بے کار (ضمیمہ ۲۱)۔

جب یہ مترضین غالب کو ذہنی سطح پر مات نہ دے سکے تو ان میں سے ایک بزرگ علی اکبر خان طباطبائی کے پاس پہنچے اور شہادت کی کہ آپ کے ایک بر خودار نے ہم سب کی بے عزتی کی ہے علی اکبر خان نے غالب کی ضمانت کی اور ان سے کہا کہ وہ جس کام کے لیے لکھنے آئے ہیں، مناسب یہ ہے کہ صرف اس پر قویہ دیں۔ انھوں نے غالب کو اس پر بھی آمادہ کر لیا کہ وہ ان شعرا سے مصافح ہی نہ کریں، بلکہ ایک سعادت نامہ بھی لکھیں۔ چنانچہ یہ معاملہ غالب کے قلم سے ایک بسترین مثنوی بعنوان "آشتی نامہ" پر منتج ہوا۔ مثنوی کے ابتدائی اشعار میں وہ اپنے مترضین کی عمریت میں زمین آسمان کے فاصلے ملا دیتے ہیں اور پھر

ان سے برہمی بے ہارگی سے ہم دردی کے طالب ہوتے ہیں۔ اپنی تقصیرات کا اعتراف کرتے ہوئے غالب سارا الزام اپنے صتر ضمیمہ کے سر درجہ کرتے ہیں اور صاف طور پر کہتے ہیں کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے وہ سب مل کر ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہاں غالب نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ میں بھی اپنے دفاع میں ہر رے حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ ہر حال، اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے انھوں نے درگزر کی استدعا کی۔ رہی قلیل اور راحت کی تنقیص، سو اس کے متعلق ان کا یہ کہنا تھا کہ وہ نظیری، عربی، غموری، غالب اسیر اور حزیں جیسے اساتذہ کو چھوڑ کر ان دو کی تقلید ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ انتہائی مجبوراً انکسار کے اظہار کے بعد وہ کہتے ہیں کہ مجھے آوریٹش بیان کا خوف نہیں، بلکہ ڈر صرف اس بات کا ہے کہ ان کی وجہ سے وہابی بدنام ہوگی۔ آخر کار وہ سب سے معافی اور درگزر کی درخواست کے ساتھ شرمی تمام کرتے ہیں (ضمیمہ ۲)۔

اس اولیٰ معاہدہ آرائی سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے فوراً بعد غالب کو بتایا گیا کہ وہ صاحب طے کے مطابق اپنا مقدمہ ریڈیٹنٹ وہابی کے توسط سے پیش کریں۔\* یہ سن کر وہ بے اشتباہ پریشان ہو گئے کیوں کہ ان کے پاس وہابی جاننے اور پھر گلشہ واپس آنے کے وسائل نہیں تھے۔ چنانچہ پرشین سیکرٹری مسٹر اسمتنگ نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ گلشہ ہی میں قیام کریں تاہم وہابی میں اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے مختار نامہ اپنے وکیل کو دے دیں۔ چنانچہ غالب نے اپنے دوست مولوی فضل حق کو، جو وہابی دیوانی و فوج داری عدالت میں سرشتہ دار تھے اور قانون سے واقفیت رکھتے تھے، اس بارے میں خط لکھا۔ ساتھ ہی انھوں نے باندے کے مولوی محمد علی خان سے درخواست کی کہ وہ التفات حسینی کو جو مولوی عزیز اللہ کے بیٹے اور مسٹر کول بروک کے منشی تھے، ایک سفارشی خط لکھیں کہ ریڈیٹنٹ میں ان کے مقدمے کی پیروی میں مدد کریں اور اگر بغرضی حال مولوی صاحب کی التفات حسینی سے واقفیت نہیں ہے، وہ حکیم سلامت علی خان کو خط لکھیں کہ اس مضمون کا خط لے کر التفات

\* کونسل کی میٹنگ ۲۰ جون ۱۸۴۸ء کو منعقد ہوئی اور یہ طے پایا کہ درخواست دہندہ اپنی عرضداشت ریڈیٹنٹ وہابی کو پیش کرے۔

حسین کو بھجوا دیں۔ اس سلسلے میں غالب نے ایک علاحدہ خط مرزا امیر بیگ کو بھی لکھا جو ہاندے کے نواب ذوالفقار علی کے پاسوں تھے۔ یہ تحریر یہاں وہ زمانہ تھا کہ غالب کو دہلی میں احباب کے خطوط سے معلوم ہوا کہ احمد بخش خان کے بیٹے اور ہائین شمس الدین خان نے اپنی فضول خیزی اور ہمزائی کے سبب نہ صرف انگریز حکام کو، بلکہ اپنی برادری کو بھی ناراض کر دیا ہے۔ غالب نے اس امر کو اپنے ہندو سے کے حق میں نیک حال مانا اور لکھتے ہیں:

شہرے کا فیصلہ کیا۔

اگرچہ غالب لکھتے ہیں شہر گئے لیکن ان کی مالی حالت اطمینان بخش نہیں تھی۔ ہاندے میں انھوں نے دو ہزار روپے نواب ذوالفقار علی کی مسرت امین کرن سے لیے تھے، اس رقم کا بیش تر حصہ لکھتے کے سفر اور چار ماہ سے زائد کے قیام میں خرچ ہو چکا تھا۔ بروز جمعہ ۷ دہی المبارک ۲۰ جون ۱۸۴۸ء انھوں نے مولوی محمد علی خان کو ہاندے ایک اور خط لکھا کہ ان کے لیے ایک ہزار روپے مزید قرض کا بندوبست کریں۔ اس قرض کے حصول میں وقت لگا۔ اس اثنا میں جاڑے شروع ہو گئے، لہذا غالب کو لینا گھوڑا ڈیڑھ سو روپے میں بیچنا اور ایک سائیں اور ایک نوکر کو علاحدہ کرنا پڑا۔ اب ان کے پاس صرف ایک کھار اور عینی نوکر رہ گئے۔ گھوڑے کی فروخت سے جوڑا، اس کا ایک حصہ انھوں نے گنبل اور کھروڑے لونی لباس پر صرف کیا اور اپنے اخراجات گم کر کے بچا اس روپے مادہ ورنیک کر لیے (خط: ۹)۔

اس تنگی ترشی میں غالب کو مولوی فضل حق جن کا خط جس میں تجویز بیش کی گئی تھی کہ پنڈت ہیرالال کو ریز پٹنسی میں وکیل کر لیا جائے جہاں چہ غالب نے اپنے ہندو سے کے سارے کاغذات بمولوی مندرجہ ذیل جمع کیے:

۱۔ غالب کے نام سیکرٹری کا وہ خط جس میں کہا گیا تھا کہ ان کا ہندو ولی ریز پٹنسی کے قونسل سے دائر ہونا چاہیے۔

۲۔ سیکرٹری کا خط کو لبروک ریز پٹنسی ولی کے نام۔

۳۔ علی اکبر خان کا خط کو لبروک کے منشی اتکات حسین کے نام۔

یہ سارے کاغذات غالب خود لے کر منگل کے روز، بتاریخ ۱۳ صفر ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۶ اگست

۱۸۲۸ء، ڈاک خانے گئے۔ انھوں نے خود یہ سارے کاغذات ایک لفافے میں، مختار نامے کے ساتھ بند کیے اور پوسٹ ماسٹر کے سامنے اس پر مہر لگائی اور نگلنے سے دہلی تک کے ڈاک کے واجبات، بمساب ایک روپیہ فی روپیہ ورن، پورے دس روپے لوا کر کے اس کی رسید حاصل کی۔ اسی یہ کاغذات دہلی نہ پہنچے تھے کہ انھیں مولوی فضل حق کا خط ملا کہ مختار نامہ بغیر رجسٹری کے نہ بھیجا جائے۔ نتیجتاً غالب نے ایک دوسرا مختار نامہ اسٹامپ پیپر پر لکھوا کر انگریزی ڈاک سے بروز دو شنب، بطریق ۵ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ، مطابق ۱۵ ستمبر ۱۸۲۸ء کو روانہ کر دیا (خط: ۱۰)۔

۲۹ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ، مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۸ء، کو جب غالب کے پاس صرف سو روپے باقی بچے تھے تو انھیں ہاندے کے مولوی محمد علی خان کی ہندسی ملی جو مولوی ولایت حسین کے ذریعے بھیجی گئی تھی۔ غالب بہت خوش ہونے اور بازار میں خود جا کر ہندسی کے مالک اور اس کی رقم کی تصدیق کی۔ انھیں معلوم ہوا کہ ہندسی لاکھ کے نام تھی اور اس کی رقم دو سو روپے تھی۔ چنانچہ غالب نے ہندسی مولوی ولایت حسین کے ذریعے بازار بھیج کر ہسٹوائی (خطوط ۹ اور ۱۱)۔

ہندسی کے ملنے سے غالب کو کھدائی سکون ملا، لیکن وہ دہلی ریڈنڈنسی میں اپنے مہذ سے کی چیونٹی کی سی رفتار پر بدستور مشغول تھے۔ سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ کاغذات کی ترسیل کے چھ ہفتے بعد بھی انھیں اپنے وکیل، میر اللہ کی طرف سے رسید کا کوئی خط نہیں ملا تھا۔ اور نہ ہی اپنے مختار یا دہلی کے عزیز و اقارب کی کوئی خیر خبر ملی تھی۔ انھیں اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف سے، جنھیں انھوں نے چلتے وقت حالت جنوں میں چھوڑا تھا، کسی خط کی توقع نہیں تھی، جب کہ اپنے ہسٹوائی پر انھیں اس لیے اعتبار نہیں تھا کہ وہ خواہ حاجی کا برابر نسبتی تھا۔ غالب نے سات مختلف اشخاص کو اپنے مہذ سے سے متعلق حالات معلوم کرنے کے لیے خط لکھے، لیکن کسی کا جواب نہ آیا۔ خاص طور پر ان کی پریشانی اس وجہ سے بھی زیادہ ہوتی گئی کہ انھیں انگریزی ڈاک پر پورا اعتبار تھا اور یقین تھا کہ کاغذات راستے میں تلف نہیں ہوتے۔

اب اُدھر یہ طویل خاموشی ان کے خیار کی کسی ہفت کے باعث نہیں تھی۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ جب مولوی فضل حق کو خٹار نامہ طو قریزہ منٹ مسٹر کولبروک دہلی سے باہر دور سے پر گئے وہ ہفتے کے روز، بتاریخ ۲ شعبان ۱۲۳۳ھ مطابق ۷ فروری ۱۸۲۸ء واپس پہنچے۔ چنانچہ ان کا دعوایین دلی بعد پیش ہوا۔ اب جب مسٹر کولبروک نے کاغذات کی بریال کی تو معلوم ہوا کہ لارڈ لیک کے نانے کے چند کاغذات موجود نہیں ہیں۔ لہذا انہوں نے وہ کاغذات گلٹے سے طلب کیے۔ غالب اس پیش رفت سے غاصے خوش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ تحقیقات آخر کار دو نکات سے متعلق ہو گی۔ اول تو ان کے اور ان کے دوسرے ہمر کا کے احمد بخش خاں کی جائیداد پر لکھنے بتایا جات تھے۔ دوسرے یہ کہ نصر اللہ بیگ خاں کی بخش میں خواجہ حاجی کا استحقاق کس حد تک جائز تھا (خطوط: ۱۱ اور ۱۲)۔

اُدھر دہلی میں یہ ماجرا تھا، اُدھر گلٹے میں غالب اپنی دمن میں لگے ہوئے تھے۔ بڑے دلی کے مسوٰخ پر، جو جمعرات، بتاریخ ۷ جمادی الثانی ۱۲۳۳ھ مطابق ۲۵ دسمبر ۱۸۲۸ء کو پڑتا تھا، وہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری مسٹر فریزر کے ہاں ملنے گئے۔ ان کی بری ابھی پذیرائی ہوئی۔ ساتھ ہی مسٹر فریزر نے انہیں بتایا کہ پرہیز ڈیپارٹمنٹ کے سیرمنٹی مولوی عبد اکرم آغواہ کی پچھی پر گلٹے سے لکھتے چلے گئے ہیں اور گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹک اور سپریم کونسل کے سینیئر ممبر ولیم ہارڈ تھامس کے لیے گئے ہوئے ہیں (خط: ۱۲)۔

فروری ۱۸۲۹ء کے شروع میں جب مسٹر ہیلی لارڈ بینٹک گلٹے واپس پہنچے تو بنارس کے راہا اودیت سنگھ شہر میں پھلے سے ولد ہو چکے تھے۔ بظاہر ان کا ارادہ جگن ناتھ کی پاترا کا تھا، لیکن درحقیقت وہ نئے صاحبوں کے حکوت اپنے احتجاج کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے، جن کی نو سے انہیں ان کی اپنی ریاست میں سلطوت و پادنا دیا گیا تھا۔ غالب کا خیال تھا کہ لکشاہی پسر میں اور جملائیں، حکومت کے احکام مسوٰخ نہیں ہوں گے (خط: ۱۲)۔ لہذا یہ طے پایا کہ راہا کے امراز میں ایک دربار عام بروز دو شنبہ، ۱۱ شعبان ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۸۲۹ء کو منعقد کیا جائے۔ جب غالب کو اس دربار کے بارے میں علم ہوا تو انہوں نے فریزر سے مل کر دربار میں شرکت کی استدعا کی۔ سیکرٹری نے بغیر کسی حیل و حجت کے ان

کی درخواست مان لی۔ چنانچہ مغرورہ دین اور وقت پر غالب و رہا میں پہنچے۔ دربار میں قسطنٹین کی ترتیب اس طرح تھی:

- ۱۔ عظیم آباد کے راہا بسوپ سنگھ۔
- ۲۔ بسوپ سنگھ کے والد اور بدراہم نامک سنگھ۔
- ۳۔ بادشاہ دہلی کا وکیل مرزا افضل۔
- ۴۔ شاہ اودھ کا وکیل قشتی عاشق علی خان بہادر۔
- ۵۔ مرشد آباد کے نواب جمالیوں جاہ کا وکیل رائے گروہاری لال۔
- ۶۔ راہا جودھ پور کا وکیل رائے جیتی رائے۔
- ۷۔ سجے پور کے راہا کا وکیل رائے رتی سنگھ۔
- ۸۔ نیپال کے راہا کا وکیل لاکانت آپاوجیا۔
- ۹۔ نواب علی اکبر خان۔
- ۱۰۔ لصر اٹھ بیگ خان کے بیٹے اسد اٹھ خان۔

عمران پوری کی اس کنکشتاں میں شامل ہو کر فطری طور پر غالب کو بہت خوشی ہوئی۔ خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ انھیں نواب علی اکبر خان جیسے عظیم شخص کے پہلو میں بٹھایا گیا تھا، اگرچہ خلافت کی بنا پر نواب خود دربار میں نہ آ سکے اور انھوں نے سعادت کر لی (خط ۷۷۱)۔

دربار میں یہ معلوم کر کے کہ آنے والے موسم برساتی میں لڈو بھٹنگ ہندوستان اور اطراف دہلی میں تین سال کے لیے چلے جائیں گے، غالب کو سخت صدمہ ہوا۔ اس خبر نے ان کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور اب گلشن میں ٹھہرنے کا ان کے لیے بظاہر کوئی جواز نہیں رہا۔ لیکن بڑا زور اور نہ ہونے کے باعث غالب فوراً عازم دہلی بھی نہ ہو سکتے تھے، لہذا منگل کے روز، ۳ رمضان ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۸۴۹ء، انھوں نے ہاندے کے محمد علی خان کو ایک اور خط لکھا کہ نواب ذوالفقار علی خان سے درخواست کریں کہ ہاندے کے امین کرن سے ایک ہزار روپیہ مزید قرض کا انتظام کر دیں۔ ایک اور خط انھوں نے مرزا منگل کے



چوٹے بانی مرزا ازبک جان کو لکھا کہ نواب ذوالفقار مرزا کو ان کی درخواست مان لینے کی ترغیب دلائیں (خط ۱۸۱)۔ ان درخواستوں کے جواب میں غالب کو شوال کے اواخر، بمطابق ۱۸۳۹ء میں ہاندے کے محمد علی خان کی طرف سے ایک شاہ جگ ہندسی علی جواںوں نے مولوی ولایت حسین کو دے کر دوسروپے میں ٹھنالی۔

اسی اثنا میں وکیل اودھ منشی عاشق علی خان نے استعفا دے دیا۔ سفیر مستفی نے اپنی اودھائی گفتات میں وکیل کی گفت کو غالب کو بتایا کہ منشی محمد مصی دہلی پہنچ گئے ہیں اور جو کام ان کے سپرد تھا، انہوں نے سنبھال لیا ہے۔ دوسرے دن غالب کو دہلی سے اپنے وکیل کا خط جس میں ریزیدنٹ کے حکم نامے، بتاریخ ۱۷ اپریل ۱۸۳۹ء، کی نقل بھی گئی تھی۔ اس خط میں ریزیدنٹ نے غالب کے وکیل ہندوٹ پیرالال کے ذریعے ارسال کردہ غالب کے کاغذات کی رسید کی تصدیق کی تھی۔ وکیل نے لکھا تھا کہ متعلقہ کاغذات سپریم کورٹ کو روانہ کر دیے گئے ہیں اور وہاں سے جواب آنے پر آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔ اس خط کے آنے پر غالب مسٹر فریزر سے ملے جنہوں نے غالب کو بتایا کہ دہلی کے ریزیدنٹ مسٹر کولبروک کو ان سے کالی ہم دروی ہے اور وہ مقدمے کا مطالعہ کر کے کورٹ کو رپورٹ بھیج دیں گے۔ چنانچہ غالب گھر واپس آئے اور انہوں نے ۳۰ شوال ۱۲۴۳ھ مطابق ۳ مئی ۱۸۳۹ء کو دہلی کے ریزیدنٹ کے منشی الفتات حسین کو ایک خط لکھا (خط ۲۰)۔

ماہ ذیقعد ۱۲۴۳ھ کے آخر، یعنی ایدہ اسے جون ۱۸۳۹ء میں غالب کو آگرے سے ۵۷ روپے کی ایک ہندسی علی اور یکم ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ مطابق ۳ جون ۱۸۳۹ء کو منشی عاشق علی خان دریا کے راستے گلگتے سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے اور فیض آباد کے حکیم ظفر علی خان نے یہ حیثیت وکیل اودھ ان کا عہدہ سنبھالا۔ اس کے بعد جلد ہی مولوی محمد انور، جو آٹھ ماہ کی رخصت پر گئے تھے، گلگتے واپس آ گئے۔ انہی دنوں میں غالب فارسی ڈیپارٹمنٹ میں یہ معلوم کرنے پہنچے کہ آیا ان کے مقدمے کے کاغذات ریزیدنٹ دہلی نے بھیج دیے ہیں یا نہیں۔ لیکن انہیں یہ سہی کہ مایوسی ہوئی کہ اس بارے میں دہلی سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔ چنانچہ ۸ محرم ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۰ جولائی ۱۸۳۹ء کو انہوں نے ہاندے کے محمد علی خان کو

خط لکھا کہ دہلی میں منتی محمد حسن کے ذریعے صفحے کے کاغذات، مجموعے میں مدو کریں۔ اسی خط میں انھوں نے دو ہاندہ ہائے تاریخ بھی نقل کیے۔ اول جو انھوں نے تعمیر مسجد کی یادگار کے طور پر لکھا تھا اور دوم سرراج الدین علی خان کے مقبرے کے بارے میں، جو بنگلی میں امام ہاڑے کے صحن میں ۱۳۳۳ھ مطابق ۲۹-۱۸۴۸ء میں تعمیر ہوا تھا (خطوط: ۲۲ اور ۲۳)۔\*

اسی اثنا میں غالب اس دربار میں جو بروز شنبہ، یکم اگست ۱۸۳۹ء، منعقد ہوا، شریک ہونے اور علی اکبر خان طباطبائی کے پہلو میں دوسری نمبر پر بیٹھے۔ یہ ایک الوداعی تقریب تھی اور اس میں اعلان کیا گیا کہ گورنر جنرل کا دفتر دریا کے راستے سے شہر میں ہندوستان کی طرف روانہ ہو جائے گا اور گورنر جنرل خود یا اکتوبر میں ڈاک سے، یا پانی کے جہاز سے، جائیں گے۔ ان حالات کے مد نظر غالب نے سوچا کہ ان کے صفحے کی متوقع رپورٹ آئندہ دو ماہ میں بھی نہیں آ پائے گی۔ اس لیے انھوں نے طے کیا کہ گورنر جنرل کی سواری کے وقت سے قبل ہی دہلی روانہ ہو جائیں (خط: ۲۳)۔

گلگتے سے روانگی کا فیصلہ کرنے پر غالب بنگلی گئے اور علی اکبر خان سے ملے۔ اس کے بعد وہ مولوی عبدالکرم کے جانے سرراج الدین احمد سے ملے اور ان سے درخواست کی کہ وہ گلگتے کے حالات سے انھیں باخبر رکھیں۔ بروز جمعہ، ۱۳ صفر ۱۲۴۵ھ، مطابق ۱۳ اگست ۱۸۴۹ء، انھوں نے لہنا سامان کشتی کے ذریعے ہاندہ سے بھیج دیا اور خود جمعرات یا جمعے کو بتاریخ ۲۰-۱۹ صفر ۱۲۴۵ھ، مطابق ۲۱-۲۰ اگست ۱۸۴۹ء، روانہ ہوئے اور جمعے کے دن بتاریخ یکم جمادی الاول ۱۲۴۵ھ، مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۸۴۹ء، ہاندہ سے پہنچے۔ یہاں انھوں نے نواب فوادنقار علی کے ہاں قیام کیا اور درود کے دن ہی مولوی محمد علی خان سے ملے۔ ہاندہ سے میں انھیں اطلاع ملی کہ مسٹر کولبروک کو معطل کر دیا گیا ہے اور ان کی جگہ فرانسس پاکنس نے لے

\* فاضل مقدمہ لار کو یہاں شعوراً سا ملاحظہ ہوا ہے۔ دراصل مقبرہ تعمیر نہیں ہوا تھا، بلکہ امام ہاڑے کے صحن میں مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ (مترجم)

لی ہے۔ چنانچہ انھوں نے بروز بدھ، بتایہ ۶ جمادی الاول ۱۲۳۵ھ مطابق ۳ نومبر ۱۸۲۹ء، علی اکبر خان کو ایک خط لکھا کہ کسی انگریز سے فرانس پکنس کے لیے کوئی سفارشی رقم لے کر دہلی ارسال کر دیں۔ اس کے بعد وہ باندے سے بروز شنبہ، بتایہ ۹ جمادی الاول ۱۲۳۵ھ مطابق ۷ نومبر ۱۸۲۹ء، دہلی کے لیے روانہ ہو گئے (خطوط: ۲۳-۲۸)۔

غالب بروز اتوار، یکم جمادی الثانی ۱۲۳۵ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء، دہلی پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے بھائی مرزا یوسف کی حالت بد سے بدتر ہو گئی ہے اور دہلی کا سیاسی موسم اس وقت کے مقابلے میں، جب وہ دہلی سے رخصت ہوئے تھے، زیادہ خراب ہو گیا ہے۔ ان مایوس کنی حالت میں انھوں نے مسٹر پکنس کی مدد میں ایک قصیدہ لکھا اور اس سے ملنے گئے۔ وہ چل کر فارسی سمجھتا تھا اس نے قصیدے کی تعریف کی اور ان سے تھریہا ایک گھنٹے تک گھنٹے کے اور ان کی شایات کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ بعد ہی غالب کو معلوم ہوا کہ رینڈنٹ دہلی نے گورنر جنرل کو اپریل ۱۸۲۹ء ہی میں رپورٹ بھیج دی تھی اور اس کا جواب بھی اسی مہینے دے دیا گیا تھا بد قسمتی کو اوجھڑ گھنٹے سے کاندھات پہنچے، اوجھڑ مسٹر کو لبروک کے مصائب کا آواز ہوا جو آخر کار اس کی معزلی پر منتج ہوا۔ پھر یہ مشکل درپیش ہوئی کہ معجزے سے متعلق کاندھات گم ہو گئے۔ نتیجتاً گھنٹے سے ان کی نقول طلب کی گئیں۔ اس کے بعد ۸ جب ۱۲۳۵ھ مطابق ۳ جنوری ۱۸۳۰ء، کو مسٹر پکنس نے غالب کا عرضی دعوہ فیروز پور کے ہاگیردار نواب شمس الدین خان کو جواب دعوے کے لیے بھیج دیا (خطوط: ۲۹ اور ۳۰)۔

جواب میں نواب شمس الدین خان نے لارڈ لیک کا خط، مرقومہ ۱۹ ربیع الاول ۱۲۳۱ھ مطابق ۷ جون ۱۸۰۶ء پیش کیا جس کی رو سے احمد بخش خان کی ہاگیر سے نصر اللہ بیگ خان کے پس باندگان کو صرف پانچ ہزار روپے سالانہ کی رقم واجب الوداع تھی۔ اور اس میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ دو ہزار روپے سالانہ خواجہ حاجی کو اور باقی تین ہزار میں مرزا نصر اللہ بیگ خان کی ماں اور بہن ایک طرف اور ان کے دو بھتیجے مرزا فوٹ اور مرزا یوسف دوسری طرف، برابر کے شریک تھے۔

## (۷)

مندرجہ بالا دستاویز کی بنا پر مسٹر ہاکنس نے ۵ مئی - ۱۸۸۳ء کو اس مضمون کی رپورٹ ارسال کی کہ مدعی کا جس قدر حصہ لارڈ لیک نے منقرض کر دیا ہے، یعنی اس کے اور اس کے بھائی مرزا یوسف کے لیے پندرہ سو روپے سالانہ اس سے زیادہ رقم کا کوئی استحقاق نہیں اور یہ وہ رقم ہے جس کی ادائیگی پر نواب شمس الدین خاں ہمیوش آمادہ رہے ہیں۔ مسٹر ہاکنس کا یہ فیصلہ غالب کو دہلی میں ریڈینٹل کے اسٹنٹ مسٹر بلیک نے زبانی پہنچایا۔

ریڈینٹل کے اس ناموافق فیصلے کا غالب نے چنداں اثر نہ لیا کیوں کہ انہیں مسٹر اسمزنگ کی، جو ابھی تک گورنر جنرل کے پریسین سیکرٹری تھے، مدد کا پورا پورا یقین تھا۔ لیکن حام کے لبوں تک پہنچنے میں بھی بڑے مراحل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ ریڈینٹل دہلی کا یہ فیصلہ گورنر جنرل کے دفتر پہنچا، ۲۳ مئی - ۱۸۸۳ء کو مسٹر اسمزنگ کا انتقال ہو گیا۔

اس فیصلے سے متاثر ہوتے بغیر غالب نے ایک اور عرضداشت بتاریخ ۷ جولائی گورنر جنرل کو ارسال کی جس میں لارڈ لیک کی سند کو ہی حیر مستند اور مشکوک قرار دیتے ہوئے درخواست کی کہ حکومت کے ریکارڈ کی پرمیال کی جانے۔ اپنے دعوے کی تائید کے طور پر انھوں نے ۲۸ جولائی - ۱۸۸۳ء کو ایک اور عرضداشت پیش کی جس میں مسٹر ہاکنس پر نواب شمس الدین خاں کی طرف داری کا الزام لگایا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک درخواست حکومت کے چیف سیکرٹری خارج سونشن کے نام بھیجی جس میں مستحق دستاویز کی پرمیال کی استدعا کی۔

مسٹر سونشن نے مستحق کاغذات کا معائنہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مدعی کی شکایت بے سبب نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے، بتاریخ ۱۹ اگست - ۱۸۸۳ء، ایک حاسن نوٹ لکھا جو مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھا:

۱۔ حکومت کے ریکارڈ میں لارڈ لیک کا ۷ جون ۱۸۰۶ء کا کوئی خط نہیں تھا۔

۲۔ ۳ مئی ۱۸۰۶ء کی سند کی گورنر جنرل ان کو لسل نے توثیق کر دی تھی لیکن ۷ جون ۱۸۰۶ء کی سند کو توثیق کے لیے سپریم کورٹ میں بھیجا ہی نہیں گیا تھا۔  
 ۳۔ برضی حال، یہ مان بھی لیا جانے کہ یہ سند لارڈ لیک نے نادا لستگی میں عطا کر بھی دی تھی تو کیا لارڈ مذکور کو یہ قانونی جواز حاصل تھا کہ گورنر جنرل ان کو لسل کے دیے گئے احکام کو منسوخ کر دے۔

یہ مستند سند اصلی ہو یا جعلی، نصر اللہ بیگ خان کا ہادی النظر میں اس سے زیادہ کا استغناء تھا۔

چنانچہ ان ثبات کے پیش نظر انہوں نے مقدمے کی سنجیدگی سے تحقیق کرنے کی سفارش کی۔

جہاں کہ سر جان سیلکم نے لارڈ لیک کی ماتحتی میں خاصا وقت گزارا تھا، متنازع دستاویز کو بتاریخ ۲۴ اکتوبر ۱۸۳۰ء ان کی رائے کے لیے بھیج دیا گیا۔ حکومت کے چیف سیکرٹری مسٹر سی فورس کو مسٹر سونٹن لے اپنے خشک خط میں واضح کیا کہ قاعدے کے مطابق مذکورہ دستاویز کی پشت پر تصدیقی دست خط نہیں دیں۔ سیلکم نے سند کا معائنہ کیا اور لہٰذا ۳۰ نومبر ۱۸۳۰ء کی یادداشت میں یہ لکھا:

میری نظر میں اس سند پر لارڈ لیک ہی کے دست خط ہیں۔ جس زمانے میں یہ دست خط لیے گئے ہیں، وہ بہت مسروریت کا زمانہ تھا اور روزمرہ کے کام کی زیادتی کی وجہ سے جمع شدہ کاغذی کام بھی نپٹایا جاتا تھا۔ نواب احمد بخش خان کو مقامی اکابر میں لارڈ لیک کا اور ان کے شناساؤں کا اس قدر اعتماد حاصل تھا (اور اس اعتماد میں مقامی حضرات بھی برابر کے شریک تھے) کہ ان کے کردار کو کسی بھی غیر ضرر فائدہ عمل کی تردید میں بخوبی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگر نواب مذکور نے کوئی ایسا غیر ضرر فائدہ عمل کیا ہوتا تو قریب قریب حالت کی شدت بھونچا سوچو ہو جاتی۔

مندرجہ بالا حکم کی بنا پر لارڈ لینکلن نے ۲ جنوری ۱۸۳۱ء کو غالب کے خلاف فیصلہ دے دیا۔

سر جان میلکم کے مندرجہ بالا فیصلے پر پہنچنے میں کچھ ہی عواہل کیوں نہ کار گر ہوں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ۷ جون ۱۸۰۶ء کی سند اس سند کو جس کی توثیق بالا عدہ گورنر جنرل ان کو قبل نے بتاریخ ۱۶ مئی ۱۸۰۶ء کی تھی، کالعدم نہیں قرار دے سکتی تھی۔ دوسرے کرنل میلکم نے حکومت کے ان احکام کی وصولی کی قصد میں بتاریخ ۱۰ جون ۱۸۰۶ء کو کی، لیکن نئی سند کا، جو صرف چند دن پیش تر ہی عطا ہوئی تھی، کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا۔ تیسرے یہ کہ ۷ جون ۱۸۰۶ء کی سند میں شاعر زید نظر کو مرزا نوشہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے (ضمیمہ)۔ اب اگر شاعر کی بات مانی جائے تو ان کو انگریز حکام مرزا نوشہ کی عرفیت سے نہیں پہچانتے تھے۔ مزید یہ کہ سند مذکور میں مرزا نوشہ بغیر ان کے اصلی نام کے نظر آتا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی امر ہے جس کی مثال عام حالات میں سرکاری دستاویزات میں، کہ شاعر مذکور کی ہنسی سے متعلق ہیں، نہیں ملتی۔ اور آخری لیکن اتنی ہی اہم بات یہ کہ لارڈ لینکلن کے وہ دست خط، جو سند مذکور کے بالائی حصے پر ہیں، ان کے ان تمام دست خطوں سے، جو انہوں نے سرکاری دستاویزات پر کیے، خاصی حد تک مختلف ہیں۔ ان امور سے نواب احمد بخش خان کے معاملات بذات خود معرض اشتباہ میں پڑ جاتے ہیں اور کان پور میں ان کی اس وقت موجودگی، جب لارڈ لینکلن نے وہ سند عطا کی تھی، مشتبہ ہو جاتی ہے۔

مذکورہ بالا امور سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ غالب جس مقصد کے لیے گلگتے گئے تھے، اس میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ اگرچہ وہاں کا قیام دوسرے بہت سے امور میں ان کے لیے ایک نعمت ناشناختہ ثابت ہوا۔ سب سے پہلے تو یہ اس سفر کے طفیل ان کا مشرقی ہند کے مختلف النوع لوگوں سے سابقہ پڑا، جس سے ان کے ذہنی افق میں وسعت پیدا ہوئی۔ مختلف لوگوں سے مل کر اور مختلف جگہوں پر جا کر انہوں نے معلومات کا ایک خزانہ حاصل کیا جو تربے کی شکل میں ان کی شخصیت کا جزو بن گیا۔ اگرچہ فیروز پور، لکھنؤ اور الہ آباد میں جس سلوک سے ان کا سابقہ پڑا، اس نے ان کے ہندو کو مجموع کیا اور کان پور کا قیام طویل بیماری

کی وجہ سے ناخوش گوار ہو گیا، تاہم ہاندے اور بنارس کی خوش گوار یادیں ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں۔

بنارس میں وہ تقریباً چار ہفتے رہے اور اس پر سے ہرے خوش ہموار پہلوؤں والے شہر کے بدھنا ماحول سے مکمل طور پر مسحور ہو گئے۔ تنہائی کی نعمت سے سرشار شہر کی خوب صورتی سے مسحور ہو کر غالب کا وہ دل تخیل کی ان بلندیوں پر پہنچا کہ ”چراغِ دیر“ جیسی شہنوی، جو ان کی فنی اور فکری بلندیوں کی عکاسی کرتی ہے، تخلیق پذیر ہوئی۔ شہر کے بدھنا ماحول نے ان کو کس حد تک سرشار کر دیا تھا اس کا اندازہ ان کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے ہاندے کے محمد علی خان کو لکھا تھا اور جس میں انھوں نے، بقولِ کس، اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

(اگر) یہ اہم مقدمہ پیش نہ ہوتا اور (سیرا) دل شامتِ ادا سے دشمنی نہ ہوتا تو سب سے بڑھ کر وہی کو خیر باد کہتا اور تسلیج توڑ ڈالتا اور (ما تھے پر) گھٹو کھینچتا اور (گگے میں) رشتہ ڈالتا اور اس رحمت کے ساتھ گنگا کنارے پیشاں چھتا تو قہقہے کہ (سیرے جسم سے) ہستی کے آکاش کی گردِ حل نہ جاتی اور میں ایک قطرے کی صورت دریا میں ضم نہ ہو جاتا (خط: ۴)۔

حقیقت یہ ہے کہ اس شہر کے تاثرات صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی آرزو تو یہ تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے بنارس ہی میں رہ بڑھتے، لیکن مجبوراً اپنی پیش کے مقدمے کی پیروی کے لیے انھیں گلٹے جانا پڑا۔

گلٹے میں غالب اٹھارہ ماہ رہے اور اس شہر کو مختلف وجوہ سے پسند کرنے لگے۔ گلٹے کی آب و ہوا انھیں اس آبی اور ان کے بہت سے پرانے عمارتوں کے رازوں سے گرمیوں میں وہ صبری کے ساتھ تازہ ناریل کا پانی پیتے، لیکن برسات کے موسم میں نہیں۔ ان کو گلٹے کی آب و ہوا دہلی سے زیادہ خوش گوار محسوس ہوئی (خط: ۸)۔ اور انھوں نے اس موضوع پر تعریف میں ایک، رہا جی بھی تخلیق کی۔ دراصل یہ امر تعجب کا باعث ہے کیوں کہ اٹھارویں صدی کے ادبا و شاعریں ایک اور فارسی شاعر اس آب و ہوا کی بدھت کرتا ہے۔ ہر صورت گلٹے

کی آب و ہوا کے متعلق ایک سنجیدہ اور متوازن رائے ایک فارسی وقایع نگار کی ہے جو کہتا ہے کہ جانوں کے ہار ماہ گلشنے کی آب و ہوا چنداں بری نہیں، لیکن گرمی اور برسات کے ہائی آئندہ بہت ہی خراب ہوتی ہے۔

غالب کے دوستوں کی طرف سے ان کی گرم جوش پذیرانی یحیٰنا گلشنے کے لیے ان کی پسندیدگی میں ایک اضافی عنصر رہا ہوگا۔ جب کسی وہ نواب علی اکبر خان سے جنگ یا مرحوم قاضی سراج الدین علی خان سے ایشیائی لٹریچر کے لیے ان کو اپنے گھر کا سا آرام ملے۔

مزید براں غالب کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو مولوی سراج الدین احمد خان، مولوی عبد الکریم، منشی عاشق علی خان، آغا محمد حسینی، مرزا احمد بیگ خان تپاں وغیرہ جیسے شخص اور بالخصوص دوست ملے۔ یہ لوگ اپنے زمانے کے بااثر لوگ تھے اور ان کے توسط سے غالب گلشنے کے احکام و اکابر سے متعارف ہونے میں گئے۔

اس کے علاوہ غالب کی شاعری کی اصل ہمدردی و قیامت کا اعتراف رئیس بہرات کے وکیل حسینی علی خان جیسے شخص نے کیا اور برطانوی کی تعریف کی۔ وہ ادبی مناقشہ جو بعد میں رونما ہوا، اس میں مولوی سراج الدین احمد اور علی اکبر خان نے ان کی حمایت کی اور یہ نواب علی اکبر خان ہی کے ایما پر ہوا کہ انھوں نے اسی بیٹا سے اور قیادت کو فرو کرنے کی خاطر "آشتی نامہ" کے عنوان سے ایک مثنوی کہی۔

احباب کی پوری حمایت کے ساتھ ہی غالب کو گلشنے کے سارے انگریزی حکام کی اعانت بھی حاصل تھی۔ حکومت کے سیکریٹری سائنس فریڈ اور گورنر جنرل کے پرشین سیکریٹری رینڈریو اسٹرنگ نے ہمیشہ ان کا برقی گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان کی پیشگی کے معاملے میں ہر قسم کی مدد کی۔ گورنر جنرل لارڈ بیٹنگ کے ۱۶ جولائی اور یکم اگست ۱۸۹۹ء کے مندرجہ ذیل بار میں غالب کو نمایاں جگہ دی گئی اور ان کو اکابر گلشنے اور غیر ملکی کے سفر کے ساتھ اپنے ہاتھ کی تلاش میں بٹایا گیا۔

برطانوی ہند کا حقیقی طور پر دارالحکومت ہونے کے ناطے گلشنے میں ایک انگریزی عروس البلاد کی ساری فضا موجود تھی۔ خوب صورت لباسوں میں پانچویں طرح دار انگریز لڑکیوں کو



دیکھ کر غالب غلری طور پر مسودہ ہوئے۔ شہر کی چمک دھمک نے انہیں ایسا سرشار کر دیا کہ وہ دلی واپسی پر بقیہ ساری زندگی افسوس کرتے رہے۔ انہیں بنگلی کے آسمان کی یاد آتی رہی جہاں جو انہوں نے اپنے دوست علی اکبر خان کو لکھا کہ ہر فصل میں دو تین بار انہیں آم بھینا کریں۔

غالب شہر کی چمک دھمک سے زیادہ لوگوں کی صنعتی عہد کی تباہ و تاب سے درخشاں توانائی سے متاثر ہوئے تھے۔ انگلستان کے صنعتی معاشرے کے صنعت کار گلگتے آرہے تھے۔ اور شہر صنعتی سرگرمی سے متحرک تھا۔ سلطنتِ اودھ کے وکیل قاضی حسین خاں، جو اس وقت گلگتے میں تھے، ایمرسن کی *Mechanics* اور *Appolonius de sectione rationis* اور سر آرکائیو نیوٹن کی *Principa* کا ترجمہ کر چکے تھے۔ ان سماجی کا افسانہ انہوں پر ایک مثبت تاثر مرتب ہو چکا تھا اور لوگ سائنسی ایجادات و انکشافات میں خاصی دل چسپی لینے لگے تھے۔ ۵ نومبر ۱۸۴۳ء کو گلگتے کے شہریوں نے ایک عام جلسے میں، جو ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا، یہ فیصلہ کیا کہ چند سے کے ذریعے ایک لاکھ روپے جمع کیا جائے اور یہ رقم اسے دی جائے جو پہلی مرتبہ دفاعی جہاز سے ایک سو پالیس دن میں اس امید، یا بحیرہِ احمر، کا کام پایہ ڈھرا سفر کرے، بشرطے کہ یہ سفر ۳۱ دسمبر ۱۸۴۶ء تک مکمل ہو۔ یہ مقابلہ صرف انگریزوں کے لیے تھا اور یہ طے پایا کہ کوئی جہاز یمن سوئٹوزن سے کم نہ ہو۔ اسی سال کیدار پور کی گودھی میں ایک اسٹیمر بنایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مقامی شناخت کے اسٹیمر ”رلوی“، ”گنگا“، ”بھگتی“، ”برہم پترا“ جیسے ناموں سے ہندوستانی دریاؤں میں چلنے لگے۔ ۸ ستمبر ۱۸۴۸ء کو ڈاکٹر لیکٹی پر لوب اور کپیشن جو لنش بنگلی نامی اسٹیمر پر دریا سے گنگا کے مسافرت کے لیے لاہور تک گئے۔ دریا میں لوہے کی طرف کا سفر جو بیس دن میں مکمل ہوا جب کہ واپسی کے سفر میں دس دن کم لگے۔ اس کے برعکس عام کشتی کو اس سفر میں تین ماہ لگتے تھے۔

دہائی جہازداری کی ضروریات نے تیز رفتار نقل و حمل کا جو نیا باب کھولا اس سے غالب، جو ہمیشہ نئے خیالات کے لیے اپنا ذہن کھلا رکھتے تھے، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مختار دورشتہ زمین سے ان کا نقطہ نظر کبھی نہیں دھندلایا، اور انہوں نے انگریزوں کے مسم ہجویا نہ اور ساتھی روپے کو ہمیشہ قبول کیا۔ ہاندے کے مولوی محمد علی خان کو ایک خط میں اس طرح رقم طراز ہیں:

”مٹی نہ رہے کہ دفاعی جہاز ان ہی لوگوں کی ایک لہاو ہے۔ اس کی رفتار تیز ہے اور اکثر اسٹیروں نے گلختے سے الہ آباد تک کا راستہ صرف دو ہفتوں میں طے کیا ہے (خط: ۲۳)۔“

یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان اسٹیروں کی رفتار، جن کے پیچھے رہائی بخشی ہاندہ دی جاتی تھی، مختلف موسموں میں دھارے کے زور اور پانی کی گہرائی کے مطابق گلشتی برہمتی رہتی تھی۔ ان دنوں تمام مقامی کشتیوں کی طرح اسٹیر بھی دریا کے کنارے کسی مناسب جگہ لنگر انداز ہو جاتا تھا۔

اگر دفاعی جہاز رانی نے حاصلوں کو کم سے کم کر دیا تھا، انگریزی ڈاک نے خطوط کی ترسیل کو محفوظ کر دیا تھا۔ غالب کو اس گلے کی کارکردگی پر بڑا اعتماد تھا اور وہ اپنے اہم کاغذات، از قسم مختار نامہ و غیرہ، انگریزی ڈاک ہی سے بھیجا کرتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس ڈاک سے بھیجے گئے خطوط ہمیشہ مکتوب الیہ کو ملتے ہیں اور اگر تقسیم نہ ہو سکیں تو ہمیشہ نامہ دار کو واپس مل جاتے ہیں۔ ڈاک کا خرچہ البتہ ایک روپے کے برابر دین کی چیز پر ایک روپیہ ہوتا تھا۔ چنانچہ غالب کو اپنا مختار نامہ و غیرہ دہلی بھیجنے کے لیے پورے دس روپے خرچ کرنے پڑے تھے (خطوط: ۹ اور ۱۰)۔

لوہر ذرائع رسل و رسائل میں یہ تبدیلیاں رونا ہوا رہی تھیں گو مہر چھا پاخانے کی لہاو نے افاعتِ علم کو انتہائی آسان بنا کر ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کر دیا تھا، چنانچہ ملک کے اہم شہروں میں یک دم نئے تعلیمی ادارے ابھر آئے۔ وارن ہسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں ”اسٹی بدارس میں پڑھانے جانے والے کے علوم کی مختلف شاخوں کے مطالعے کے لیے“ گلشت مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ ”اسی طرح لارڈ ویلنگٹن نے گلختے میں کمپنی کے انگریز عہد میں کوٹلی ماسٹر اسکول کے طے پر ملاحظہ فرمائیے۔“

زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے جان بادشک گل کرست کی زیر نگرانی "غورث ولیم کولج" کی دیرخ بیل ڈالی۔ جان گل کرست کی دلی خواہش تھی کہ ہمداد جلد نصابی کتابیں تیار ہو جائیں۔ ان حالات میں ترجمہ ہی واحد طریقہ کار تھا۔ انھیں خوشی ہوتی اگر معیاری انگریزی کتابوں کا فارسی یا ہندوستانی میں ترجمہ ہو جاتا، لیکن انھوں نے جو ہنسی اور مولوی حکیم رکھے ان میں سے چند ہی انگریزی کی سہاریات سے واقف تھے، لہذا انھوں نے نصاب کے لیے وہ مشہور فارسی کتابیں مقرر کیں جو انگریز طلبہ کے لیے دل چسپی کا باعث ہوں۔ اس ذیل میں انھوں نے ستر جہیں کوہدایت کی کہ اختصار کے ساتھ ہی سہی، لیکن انگریزی نثر نویس کے خاصائص، مثلاً سادگی، سلاست، صفائی اور فطری طریقہ اظہار کو بروئے کار لایا ہائے۔ اس پالیسی کے تحت ڈاکٹر گل کرست نے ۱۸۰۳ء میں The Oriental Fabulist کے نام سے قدیم انگریزی زبان کی کہانیوں کا ہندوستانی، فارسی، عربی، برج، بھاشا، بھگ اور سنسکرت میں ترجمہ کر کے روسی رسم الخط میں چھاپا۔

گھٹنے میں غالب کولج کو نسل کے اہم رکن رینڈریو اسٹرنگ، سمبسن کے شعبہ فارسی کے میر مٹی مٹی عبد الکریم اور کولج کے شعبہ فارسی کے میر مٹی مولوی کرم حسین سے ملنے کا موقع ملا اور وہ تحریر میں سادگی کی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مسیح و مشقی نثر کا اس قدر رواج تھا کہ شروع شروع میں تو اس سادہ طریقہ کار کا لوگوں نے مذاق اڑایا لیکن رفتہ رفتہ، بوجہ، ہی طریقہ اظہار چھا گیا۔

اس سادگی کی تحریک سے متاثر ہو کر غالب نے بھی صنعتِ تسلیل جیسے صنائع کا

• ماضیہ مستحقہ بہ صلوٰۃ کہ شتہ

گھٹہ مدرسہ وارن ہسٹنگز (Warren Hastings) نے اس کی بنیاد رکھی اور اپنے ذاتی خرچ سے اسوی قانون اور عربی و فارسی کی تعلیم کے فروغ کے لیے کولج کی عمارت تعمیر کرائی۔ ۱۸۲۰ء میں کولج کی تشکیل نو ہوئی اور ویلز اسکوائر Wellesley Square کے شمال میں ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت سے ایک اور نئی عمارت بنائی گئی۔ ۱۸۲۹ء میں اس میں انگلش ڈیپارٹمنٹ بھی کھولا گیا۔

الترام اور مفتی و مسخ عہدات کا اہتمام چھوڑ کر سادہ فطری انداز اختیار کر لیا۔ اگرچہ ان کی نثر میں کافیہ پسائی اور ایک سادہ آہنگ کے آہر صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن انھوں نے جہاں کھیں ہو سکا، پرانے طرز تحریر اور طریقِ خطاب و آداب کو ترک کر کے اپنے مکتوب المیم سے سادہ اور بدلو راست بات کرنے کا انداز اختیار کیا۔ وہ اپنے خطوط کا اختتام آخر میں صرف لہنا نام لکھ کر کرتے۔ خط کے بارے میں ان کا موقف یہ تھا کہ نوشتن اور گفتن میں سرِ موقر نہیں ہونا چاہیے۔

اسلوب کے علاوہ انگریزی اثرات غالب کی ان تراکیب سے بھی ظاہر ہوتے ہیں جو انھوں نے نئے خیالات کے اظہار کے لیے اور ان لوگوں کی نشان دہی کے لیے وضع کیں جو انگریزوں کے جلو میں نہ نما ہوتے۔ وہ اکثر و بیش تر اگرچہ تصوری تبدیلی کے ساتھ انگریزی الفاظ جیسے مسٹر، لارڈ، گلشئر، سیکرٹری، گورنر، ریزیڈنٹ، جنرل، اسٹنٹ، کونسل، رسید، کمپنی، رپورٹ، نمبر، نوٹ و غیرہ استعمال کرتے ہیں۔ ان الفاظ کے استعمال کا ایک حیران کن زاویہ یہ ہے کہ وہ بلا تامل فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ انگریزی لفظ کا پیوند لگا کر مرکبات بنا لیتے ہیں، مثلاً حملہ کو نسل، احمیان کو نسل، کائناتِ اسٹامپ، دفتر ریزیڈنسی، رپورٹ ثانوی، درست گورنری، رپورٹ متحدہ و غیرہ۔ بعض اوقات وہ انگریزی کے وہ الفاظ کے درمیان اساطت لگا کر استعمال کرتے ہیں جیسے سیکرٹری کو نسل، پاسیکرٹری ریزیڈنسی۔ ان تراکیب کے استعمال کا ایک اور دل چسپ پہلو یہ ہے کہ وہ انگریزی لفظ کی مدد سے ایک فعل مرکب بنا لیتے ہیں، مثلاً رپورٹ کروان۔

خلاصہ یہ کہ غالب کا گلشن کا قیام، جس کا ذکر ان خطوط میں ہے، ان کی زندگی کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ اگرچہ وہ اس نا انصافی کو، جو ان کے حق میں روا رکھی گئی تھی، درست کرانے میں کام یاب نہ ہو سکے، تاہم گلشن اور بنارس کے قیام نے ان کے ذہنی افق کی توسیع میں بڑا کردار ادا کیا اور اس کا اثر ان کی شخصیت اور آفرکار اسلوب پر بھی پڑا۔ ان حالات میں اگر وہ بنارس اور گلشن پر اپنی ساری محنتیں نکال کر لے نظر آئیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ نفل بالترتیب ہندوستانی جٹ پٹے کی خام اور صبح کی علامت ہیں۔

## غالب کے سفر کی توقیت

۱۸۴۵-۲۹

- ۱- ۱۸۴۵ (اندرا سال کے وسط میں) دہلی سے فیروز پور جمر کے لیے روانہ ہوئے۔
- ۲- جنوری ۱۸۴۶ فیروز پور جمر کے لیے روانہ ہوئے، درود کاں پور۔ کان پور میں بیدار ہو گئے اور عازم لکھنؤ ہوئے، درود لکھنؤ۔
- ۳- ۱۵ اگست ۱۸۴۶ آسامیر کے لیے صنعت تعطیل میں ایک نثر انشا کی۔ پانچ ماہ اور کچھ دن قیام کر کے لکھنؤ سے ہاندے پہنچے، جہاں تھریہا چھ ماہ قیام کیا۔
- ۴- ۱۸۴۷ ہاندے سے براستہ سوہو چلے تارا کے لیے روانہ ہوئے۔ چلے تارا میں ایک دن قیام کے بعد کشی کے ذریعے ار آباد پہنچے۔ ار آباد میں ایک دن قیام کے بعد بنارس کے لیے روانہ ہوئے۔ بنارس میں چار ہفتے قیام کے بعد عظیم آباد کے راستے مرشد آباد کے لیے روانہ ہوئے۔
- ۵- ۱۸۴۸ مرشد آباد سے گلشن کے لیے روانہ ہوئے۔
- ۶- ۲۰ فروری ۱۸۴۸ درود لکھنؤ۔
- ۷- ۲۴ فروری ۱۸۴۸ نواب علی اکبر خان طہا پانی سے ملنے چلی گئے۔
- ۸- ۶ اپریل ۱۸۴۸ سرانج تھری علی خان کی بیگم سے ملنے انشائی گئے۔
- ۹- ۱۳ اپریل ۱۸۴۸ مرزا یوسف کا خط ملا، جس سے معلوم ہوا کہ لن کی بيساری میں لگا ہوا ہے۔
- ۱۰- ۲۸ اپریل ۱۸۴۸ گورنر جنرل کے پریشی سیکرٹری اینڈ یور اسٹرنگ اور حکومت کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری مسٹر سامی ٹریڈ سے ملاقات کی اور اپنا عرض وخواہش کیا۔

- ۱۱- یکم جون ۱۸۲۸ء۔ گلشدر سے کے متاعہ میں حرکت کی۔
- ۱۲- ۸ جون ۱۸۲۸ء۔ مشاعرے میں حرکت کی۔ رنجیں ہرات کے وکیل مرزا حسین علی نے برہی تعریف کی، لیکن قتیل کے ہم نواوں نے تنقید کا نشانہ بنایا۔
- ۱۳- ۱۵ جون ۱۸۲۸ء۔ مشاعرے میں حرکت کی اور اپنے ناقدین کو جواب دیا۔
- ۱۴- ۲۰ جون ۱۸۲۸ء۔ سپریم کونسل سے ہدایت ہوئی کہ دھوا رینڈنٹ دہلی کی عدالت میں دائر کیا جائے۔ باندے کی مولوی محمد علی خان سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک ہزار روپے قرض کا بندوبست کریں۔
- ۱۵- ۱۵ ستمبر ۱۸۲۸ء۔ اسٹامپ پیپر پر اپنا مختار نامہ دہلی روانہ کیا۔
- ۱۶- ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۸ء۔ باندے کے مولوی محمد علی خان سے دو سو روپے کی ہندھی ملی۔
- ۱۷- ۲۵ دسمبر ۱۸۲۸ء۔ بڑے دن کے موقع پر مسٹر فریزر سے ملاقات کی۔
- ۱۸- ۱۰ فروری ۱۸۲۹ء۔ دہلی رینڈنٹس میں دھوا دائر کیا گیا۔
- ۱۹- ۱۶ فروری ۱۸۲۹ء۔ گورنر جنرل کے دربار میں حرکت کی۔
- ۲۰- ۱۰ مارچ ۱۸۲۹ء۔ باندے کے مولوی محمد علی خان سے درخواست کی کہ ایک ہزار روپے قرض کا مزید بندوبست کریں۔
- ۲۱- مئی ۱۸۲۹ء۔ باندے کے مولوی محمد علی خان کی جانب سے دو سو روپے کی ایک شاہ جوگ ہندھی وصول ہوئی۔
- ۲۲- جون ۱۸۲۹ء۔ ۵۳ روپے کی ایک ہندھی آگرے سے وصول ہوئی۔
- ۲۳- یکم اگست ۱۸۲۹ء۔ گورنر جنرل کے دربار میں حرکت کی اور معلوم ہوا کہ وہ جانب ہندوستان دور سے پرہانے والے ہیں۔
- ۲۴- ۲۱-۲۰ اگست ۱۸۲۹ء۔ گلشنے سے باندے کے لیے روانگی۔
- ۲۵- ۳۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء۔ ورود باندہ۔
- ۲۶- ۷ نومبر ۱۸۲۹ء۔ باندے سے دلی کے لیے روانگی۔
- ۲۷- ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء۔ ورود دہلی۔



خطوط





کم از آنم که درِ معذرتم باید زد  
بیش از آنی که دهبی خجلتِ تقصیر مرا

ندانم خامه آهنگِ گزارشِ مدحِ اخلاقِ که  
دارد که در میدایِ تحریر از نقطه هزار جا پشتِ  
دست بر زمینی می گزارد. قاعده بخود فرو  
رفتگایِ شرمِ ناکسی سر از پشتِ پا برنداشتی  
است و آدابِ سایه در پیش گاهِ سطوتِ آفتاب  
خود را موجود نه پنداشتی. اعتمادِ کدامِ طاقت  
را سرویرگیِ ذریعه عرضِ سخنی گردانم و به  
نیروی چه نسبتِ جراتِ فضولیِ گفتگو بهم  
رسانم. حقا که اگر وسعتِ حوصله کرم در ضمیر  
نه گزشتی، عنایِ خودداریِ بگسیختنی و اگر  
اندیشه به پشتِ گرمیِ امیدِ عفوِ قویِ دل  
نگشتی، این چنین بی محابا خوب لفظ و آبروی  
معنی نه ریختمی.

(شرعاً) میری حیثیت اتنی بھی نہیں کہ میرے لیے معذرت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے  
(لیکن) تم اس سے بلند ہے کہ مجھے میری تقصیر پر ہر مندہ کرے۔

میں نہیں سمجھتا کہ (میرا) ظلم کس کے اخلاق کی تعریف کی  
گزارش کا ارادہ رکھتا ہے کہ میدانِ قمر میں ہزار جگہ نقطے کے ذریعے  
مجرم کا اظہار کر رہا ہے۔ بے بسا عفتی کی حرم میں فرق ہو جانے والوں  
کا قاعدہ تو یہ ہے کہ اپنی گردن بھانے رکھیں اور سائے کے لیے  
آفتاب کی شوکت کی پیش گاہ میں بھی لوب ہے کہ اپنے وجود کو  
ناموجود ہانے۔ کون سی طاقت کے اعتماد کو ذریعہ عرضی سخی کا  
سانہ سامان سمجھوں اور کس تعلق کے ذور پر اس ہرزہ سرائی کی جرأت  
کوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر (تیرے) کرم کے حوصلے کی وسعت  
میرے ضمیر میں جا گزریں نہ ہوتی (تو میں کب کا) ہوش و حواس کی  
باگ توڑ چکا ہوتا اور اگر (میری) فکر کو تیرے درگزر کی امید سے ڈھارس  
نہ ہوتی تو (میں ہرگز) اس طرح الفاظ کا خون اور مسافہ کی آہوریزی نہ  
کرتا۔



آہنی کی سلطنت کے حاکم، (اور) ساکنوں کے مہروم و پناہ گاہ (خدا آپ کو) سلامت (رکھے) (۱)

بدیہ شاہ بخاریہ کے بعد یہ عرض ہے کہ میر صاحب شفیق میر کرم علی صاحب اکثر اوقات آپ کی طرف سے تحریریں نہ لائے کا عذر کرتے رہتے ہیں اور اس ناپسندیدہ صورت اور مہروم سیرت کی اپنی زبان گھراٹھاں سے تحریریں کرتے ہیں۔ اس بات پر کہ دل سے زیادہ دکھا ہوا ہوں چلنے کی زحمت گوارا کی جاسکتی ہے یا قصہ میں اس قیامت کے حد سے کے متحمل۔ (میر سے لیے) اس قدر کافی ہے کہ مجھ جیسے تنگ و جھوٹ کو آپ قبولیت کی بزم کے صدر میں بٹاتے ہیں اور اس جاہل و نادان کو۔ جانتے ہیں کتنی ناخنگ گزاری ہے اگر میں اس افتخار پر گھبرائے نہ کہوں اور کتنی حق ناشناسی ہے اگر میں (مہروم زیارت کی) تکی میں اپنی آنکھیں آپ کے تنوں سے نہ لٹوں۔ یہ جو میں جناب کی خدمت میں طویل و قلیل کے بعد پہنچا ہوں اس کا سبب یہ نہیں کہ شوق حیا کش نہیں ہوتا، بلکہ (در اصل) میری نارسائی ہی نارسائی کی دلیل ہے اور میری ولادت کی ہی میری خشکی کا عذر خواہ ہے۔ وغیرہ ناقرانی نے بسترِ بیدار کی طرح میرے بدن ہی پر نہیں، چہرے پر ہی سیکڑوں گلکٹیں ڈال دی ہیں۔ میرا جسم انتہائے افتخار کے دہا کی طرح ہو گیا ہے۔ \* امیر تازہ یہ ہے کہ اس خشک سالی میں مجھ میں

\* دہا وہ کپڑا ہے جس کے عام طور پر دسے بنائے جاتے ہیں اور پدے چوں کہ پڑے رہتے ہیں اس لیے لفظ افتخار کی سے اس میں معنوی نسبت بھی ہے۔

سفر کی طاقت ختم ہو چکی ہے۔ " اور جیسے پیچھے بری پہلی زندگی گزر ہی گئی۔ "۔ " ہوں کہ آخر کھڑا اضطرارِ انصافِ طبعی کا نتیجہ تو اسے انسانی کے سکوت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، (اس لیے اب) مجھے آرزو سے شر سے حل اور لکڑی منی سے ٹھیکیت ہوتی ہے (جب کہ) اس سے بیش تر جب خواہشِ دل کی شد پر میں کارخانہ رنگ و بو کا فریفتہ تھا اور (جب) آرزو کی پستانیوں میں بے پروائی سے گھسا کر تھا، سیاہ مستوں کی طرح غریب کشیدہ آتش رہتا تھا۔

یاد باد آں روزگاروں کاستباری و اشتیم

آہِ استنک و چشمِ اکھباری و اشتیم

(وہ بھی کیا ناز تھا کہ (کوچہ خنق میں) ہماری ہمدرد منزلت تھی۔ ہماری آہ سے شعلے

اور آنکھ سے آنسو ٹپکتے تھے۔)

اب شوق کی وہ شعلہ فٹانی کہاں، جو سانس کو شعلہ دہوں سے معزول رکھے، \*\*\* اور فکر کی ہمارا وہ جوش کہاں کہ میری کتبِ خاک کے پردے سے لاد و گل کا طور ہو۔ یہ جو حبیبِ خیال پر اک کو نہ ادا لپکتا ہے (تو دراصل) یہ تو چراغِ دل ہے کہ بجنے سے پہلے بھڑک رہا ہے۔ مختصر یہ کہ مجھ جیسے شخص کی فکرِ ندرسا کی تعریف اور مجھ جیسے رندِ بے سرو پا کی توصیف (دراصل) مراسمِ حمایت کی تسبیح اور شفقت کے مراتب کی تکمیل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بیچ کو اس کی ساری تقصیرات کے ساتھ قبول کرنا اور بُرے کو اچھا کہنا آئینی بندہ نواری اور نورشِ حیران کی کے سوا کچھ اور نہیں۔

\* اس جملے میں لفظ "تاریخ" اور "بدا بد محنت" وہ دونوں محلی نظریں، ساقی و سہاق سے یہ معنی درست معلوم ہوتے ہیں۔

\*\* اس جملے میں بھی "گزشت" کا داخل نہیں، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی لفظ رہ گیا ہے۔

\*\*\* یہاں معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے غلطی سے لفظ "نہ" برسی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ لفظ "نہ" سے جملے کا مطلب ہی غلط ہو جاتا ہے۔

(سیری) نثر کے دو مسودے، جن میں سے ہر ایک کو سہی قرر نے ایک ملاحظہ طریق سے ہمارے الفاظ پہنایا ہے، آپ کی نظر سے گزریں گے اور (امید ہے) جناب کی نگاہ، قبول کی روشنی میں، راقم کی سرافرازی کا مشور ثابت ہوگی۔ پہلا مسودہ ایک خط ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ سفر مشرق کی تیاری کی ابتدا میں جب فیروز پور میں، جو میرے بچا فزالدولہ والد الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ کی جاگیر ہے، تین اپنے بچا کے پاس رہ رہا تھا، دارالعلوم (دہلی) میں میرے ایک دوست خزانہ مولوی محمد فضل حق (بھی) بدوہاں رہتے تھے (لیکن) میں نے انتہائی عجلت میں انہیں خدا حافظ کہا اور ان سے اتنی دواغ لیے بغیر لہسن منزل مقصود کی طرف تیرکھدی کی قودہاں پہنچ کر میں نے ان کی خدمت کثیر الاوقات میں ایک معافی نامہ تحریر کیا، جس میں صنعت تعطیل کی رعایت رکھی۔ قودہ (خط) یہ ہے:

مالوں کے عالم، مشور زمانہ عالم، عالم باعمل و عاملی باعدل، عظم کی پہچان اور عمل کی داستان، خدا آپ کے اکرام ہمیشہ قائم رکھے!

(میں) اللہ کے خراب دنیا (ہوتے ہوئے) اور بدول سے آگاہ ہوں، سلام مسنون ادا کر کے اپنے مذمہ کے اسرار کھولنے کا ارادہ کرتا ہوں۔ ایک دوسرے سے مل کر دواغ نہ ہونے کا دکھ اگر مجھے سیکڑوں عمر سنج و غل میں جھکار گئے تو روا ہے، لیکن خدا کی قسم (حق یہ ہے کہ) میں مکمل ہوش و حواس کھو کر سر تاپا و ہم و ہراس بن گیا ہوں۔ اگر میرے آکا کو مجھ سے گھر ہے تو انتہائی افسوس کا مقام ہے۔ جب آدمی نے خدا سے کیے ہوئے عہد کو بھلا کر زندگی کو نمود و لعب کی نذر کر دیا اور دواغ کو ہوس کی لذت میں اور دل کو حرص میں مکمل غلو پر گرفتار کر دیا، (تو) دنیا میں اس نے اپنے لیے بد بختی کا اور ماقبت میں ناکامی کا سودا کر لیا۔ دل آگاہ کو مصالح کا سمجھنا آسان ہے، لیکن بھگتے ہوئے شخص کے لیے اصلاح احوال ناممکن ہے۔ آپ کے عظم و انگلی کے سلطان ہیں اور سیری ہر درد اکودہ سالہ (خود بھی) گواہ ہے کہ میرے دل سے، جو محنت کا گھوارہ ہے، حرص و ہوس رخصت ہو چکی ہے اور گروہل نے مجھے ایک غمراہ دکھ کے پکر میں ڈال دیا ہے۔ واللہ، میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر مرد ہوں تو نمود و لعب

کے پاس نہ پہنچوں گا، یقیناً اسی راستہ پر رہوں گا!

میرے کرم فرما، میرے جھوم! فی الحال کہ راقم الطور والدہ الملک کے پاس قیام پذیر ہے، اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ ساہوکار سے لین وین کا حساب کتاب کر کے اور اس کے قرض سے متعلق اصل و سود سے آگاہی حاصل کر کے سفر کا آغاز کر دے۔ لیکن دلِ وارفتہ کہ (ہیش) میری کام بانی کا دشمن رہا ہے، صراغوردی پر انگیز کرتا ہے۔ اوجھ میرے علم محترم (بہن) کے دشمنوں کے وہم و ہراس میں، سرکارِ اورد کے محاصل وصول نہ ہونے کے درد میں، گری کی آمد کے رنج میں جتنا و سوگ وار و بے چین (بھلا) ان میں اتنی مروت کہاں کہ کسی کی دل دہی کریں اور (اتنا) حوصلہ کہاں کہ کسی کے اصطلاحِ احوال کی طرف توجہ دیں (اوجھ) میرے دل کو وہ آسودگی کہاں حاصل کہ اپنے سرورِ آلودہ کو پہاڑ سے جا نکلایں۔ اور دل کو اندازِ کار کی طبع میں امید کے لبتا ہی بعنود میں رکھوں۔ حاصلِ کھم یہ کہ (میں نے) اپنی بد قسمتی کی شہادت کو رخصت کر کے خدا کے کرم و فضل کی وسعت کی ٹوہنی اور بھلی ہے (اور اب) صراغوردی کا اروہ ہے کہ عہد کی صورت اور آمد ہی کی طرح دنیا میں گھومتا پھروں۔ اگر نیک بنتی نے کہ جس پر ظلم مراد لکھا ہے، یادری کی اور عروس مقصود راقمِ المروت و دعا گو کے دامِ اروہ میں آگئی، فیما اور نہ لکھی میرا انگلہ دم ملکِ بدم کو ہو گا (اور اس طرح تیں) دنیاواروں میں نہیں نوبِ انسان کے لیے باعثِ فحرم (بنتوں گا) ملکِ اللہ کے لیے ہے اور حکمِ اللہ کے لیے ہے۔ یہ تحریر کیا گیا!

مرمر صد دم سرور آمد دل

ہر درد و (ہر) گرد آمد دل

کہ کرم کلامِ دلِ ما گرد

کہ دردم دامِ دلِ ما گرد

ہو بہ طرۃ طرار لو را

حرمی وصل و سرِ دلدار لو را

سادہ دل گردِ ہوسا گرد  
کہ عملِ دامِ گلسا گرد

[دل (گولہ) سیکنوں سرور آپوں کی آمد ہی تھا۔ دل مضی در دو غم تھا۔  
کبھی کرم ہمارا حاصل مقصد ہوتا ہے۔ کبھی درم ہمارے دل کے لیے چال ہی جاتا ہے۔]

اُس (دل) کو (محبوب کے) طرہ طرار کی ہوس (درہتی ہے)۔ اُس (دل) کو (محبوب کے) وصل اور سر کی حرص (درہتی ہے)۔  
(وہ) نادان حرص میں گرفتار رہتا ہے۔ جس طرح شہدِ نخلیوں کے لیے چال ہی جاتا ہے۔]

سوداگر و الزام کے معاملے نے (آپ کے) محبت بھرے، نورانی آگیں دل کو بھرد۔ محبت کی طرف سے سرور کر دیا اور (اُس کے، یعنی سوداگر کے) تلوار آسا، کونہ آتار اور اندوہ آگیں کلام نے آپ کے پیار بھرے دل میں دکھ کی گرہ ڈال دی۔ امید کرتا ہوں، یہ سچ دل سے دور ہو جائے گا اور درخواست کرتا ہوں کہ دل کی اس گرہ کو کھول دیں۔ کیوں کہ یہ گرہ در گرہ دل خواہشِ قلب کے لیے چال ہی جاتے۔ خداوندِ محبت، اللہ آپ کو طویلِ زندگی اور دواہی (سلامتی) عطا کرے اور نتیجہ ہمیشہ تکمیلِ رضا و صلاحِ احوال پر ہو۔ والسلام و لا کرہم۔

ایک دوسرا مسودہ ہے جو لکھنؤ میں سہانی علی خان و میر نیاز حسین خان اور دوسرے نئے اصحاب کی تجویز پر۔ (قیاسی: بطور) ایک عرضِ داشت کے مستند الدولہ کے لیے لکھا گیا ہے۔ ہر چند کہ عاصمانی سرکار نے دوستِ نورانی کا ثبوت دیتے ہوئے اس پر مدوح کے سامنے میری برہمی تعریف و توصیف کی اور ملاقات کا بندوبست کیا، تاہم چوں کہ پہلی ہی ملاقات پر معاملے کے باب میں اُس جانب سے۔۔۔ (قیاسی: ایسی) باتیں ہوئیں کہ یہ امر قدسی خارج میں صورت پذیر نہ ہوا۔ چوں کہ اس خاکِ سار کا دل امورِ مومنہ ہالا کی وجہ سے زخمی، ایک در زخمی سامنے اور مقصدِ و شوار در پیش تھا، لہذا میں نے استغنا کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہنی



جاک ساری کی ضرر رکھ لی اور اپنے دامن کو ان بے اصول نووولتوں کے اختلاط سے سمیٹ لیا۔ اگرچہ اس خواہش کا نقش سینے سے محو ہو چکا ہے تاہم وہ تھرہ کاغذ پر موجود ہے، چنانچہ اس قلم پرزہ سرا سے تھرہ کر رہا ہوں۔

محبت کے ملک کی مرصفتوں کے بانی، نیک بنتی سے کام ران، عطا و کرم کے سورج کی جاسے طلوع، رُبدۂ دہقانِ آدم، خدا آپ کی عطا کو قائم اور مراتب کو بلند کرے۔

دعا گو محمد اسد اللہ آل جناب کی خدمت میں مراسمِ احترامات ادا کر کے اور دروول کے کھڑے کا میرا کھول کر، اطلیحِ حال کے ساحل پر، امید کے موتی کے حصول کی خواہش رکھتا ہے۔ دروالم نے میری روح کو ہاؤ کی طرح سرا سر ٹھنڈی آبیوں کے ہال میں گرفتار کر رکھا ہے اور سودا کے دھوئیں کی بندھی نے میرے دلِ وارفتہ کو (برا نگینتہ کر کے) دُمِ طاووس بنا دیا ہے (اپنی کم حوصلگی کے باوجود) دلِ کم حوصلہ نے کائنات کے غصوں کو دعوت دے کر جمع کیا ہے اور وہم و ہراس نے دلِ آلودہ کے لیے سرا سرا گر و ملل کو آزاد کر دیا ہے۔ میری مسافت کا ربر آری کی صدا سے محروم ہے اور میرے لاسر کو اپنے مقصدِ مساعد کی کھائی کا لمس حاصل نہیں۔ دنیا سے رحم و کرم کی رسم و راء اٹھ گئی ہے۔ دعا گو کے لیے بھی دردِ سوال کرنا باعثِ تنگ ہے، اور نمانے کے اہلِ بہشت کا احوال بھی پوشیدہ نہیں کہ ہر شخص کہ ہارہ کار کے لیے (گفتا ہی) دوڑے (آخر کار) اپنے سرِ دردِ آلودہ کو کسی پہاڑی پر دے دیتا ہے، مگر سرکارِ اودھ کی حدود میں عدل و انصاف کے معیار نے (گوہا) سارے نمانے کو گل کہہ فارم بنا دیا ہے اور عطا و کرم کی ہارش نے آرزو گاہِ دنیا کو (بھی) حصولِ دعا کے ہال میں پھانس لیا ہے۔ میں نے (بھی) ارواہ کیا ہے کہ (آپ کی) بہشت جیسی درگاہ میں پہنچ کر گئی مرلو کا خطر اپنی آرزو کے لباس میں لگاؤں۔ غرض کہ آرزو کے تیر کا دکھ دل میں اور سودا کے لوہام کا دھواں سر میں لے کر میں نے اس طویل مسافت کی مشقت برداشت کی اور اپنی سواری کو راستے پر ڈال دیا۔

اٹھ کا ٹکڑ ہے کہ اپنے بہتِ رسا کے ساتھ دو سو کوس کی صم طے کر کے اودھ میں غاصی سلسلہ آل محمد ﷺ کی ڈیوڑھی پر وارد ہوا ہوں۔ اگرچہ میں اس وسعتِ نمانہ میں

اہل کمال کے درمیان گرد کی مثال ہیں لیکن سرکارِ عالم میر کا مذاق ہوں اور میری تحریروں میں اس مدح کے موتیوں کی ایک دنیا موجود ہے۔ میرے اُس دل نے جو محفلِ راستی ہے، محبت کی داغ بیل ڈالتے ہوئے، مثنیٰ فلک کے قلم سے چند سادہ مصرع تحریر کیے ہیں۔ چنانچہ رقم کرتا ہوں:

اکرم اہلِ کرم اسیدِ اولادِ رسول  
 ولیدِ داورس و سرورِ عالم آرا  
 ویرِ او مصدرِ عدل و کرم و سرور  
 دلِ او مطلقِ علم و عمل و مہر و عطا  
 عدلِ را راہِ ویرِ درگیرِ او کردہ طلوع  
 ملکِ را گزیرِ رہِ عنکیرِ او دادہ یلوا  
 گر دوزِ گزیرِ سمِ او ہمِ او درِ عالم  
 ہر مہرِ دہرِ طلا گزیرِ او ہر صعوہ بُھا  
 ویرِ او آمدہ درگاہِ ملکِ عالم  
 کہ گدا آمدہ کاوس و دغاگو دارا

[اہلِ کرم میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہے (اور) اولادِ رسولی علیہ السلام میں سب سے زیادہ مساوت والا (وہ) عمل کرنے والا حاکمِ دنیا کو زینت بخشے والا سرور ہے۔  
 اُس کے دروازے پر عدل و کرم اور خوشی و شادمانی کا تصور ہوتا ہے اور اُس کے (افق)ِ اول پر علم و عمل اور مہر و عطا طلوع ہوتے ہیں۔  
 اُس کی درگاہ کے دروازے نے عدل کو راستہ دکھایا ہے (اور) اُس کی فوج کے راستے کی گردِ ملک کے لیے حکم بھی گئی ہے۔  
 اگر اُس کے مثنیٰ گھوڑے کے سُم کی گردِ دنیا میں اڑے تو دنیا کا سارا جہنم سونا اور ہر چیز ہما بھی جائے۔

اس کا دروازہ شاہانہ عالم کی (دور) درگاہ ہے جہاں کاوش سالی ہے اور دارِ اوماگو۔]

اسے صنعتِ عالم، میری روحِ مصائب کی زنجیروں میں (مگر تیار) ہے اور پھریوں کا سُخِ دل کی طرف ہے، \* (اور) وہ دل کہ دردِ آشنا، دوا سے محروم ہے، مرہم کی خواہش رکھتا ہے کہ میری زبوں مالی نے میرا احوال تو بالا کر رکھا ہے۔ میری تشا یہ ہے کہ جنابِ عالی میرے اعلیٰ کلام اور گوہرِ کمال کو مطالعہِ عالم آرا کی لٹری میں پڑھیں تاکہ سُنا بھی ہم منصبِ ماہِ نور گیس بھی ہم سرِ سُنا ہو جائے۔ محبت کے بادشاہ، سرداروں کے سردار، عالموں میں بے نیازِ اہلِ کرم کے سرِ خیل، امیروں کے ستون، مسکات کے محور، بلند ہمت رکھنے والے کو (خدا) ہمیشگی کی بنیاد رکھنے والی عُمر، دنیا کی اطاعت والا حکم، دشمنی کو مٹا دینے والا (اور) عدو کو مسل دینے والا فرمان، آسودہ دل، مبارک قسمت عطا کرے۔

عزیزِ ابدِ ابد دوم عزیمتِ المرام

مکرمی و محدودی!

میں جانتا ہوں اور میرا دل جانتا ہے کہ اس حسی اتفاق پر کس قدر مسرور ہوں کہ میری دعا سے بے اثر و بیگانہ قبولیت کو، جسے اہلِ ہوس کے بے انصاف دلوں کی آہ و بکا کی طرح راستہ نہیں ملتا تھا، اس عبودیتِ نامے کے احتیاج پر خلعتِ قبولیت ملے۔ دعا سے خاطرِ مشفق کا نقش بھی کرسیِ فضیلت پر ہو گیا (یعنی دعا حاصل ہو گیا) اور وفات و اتفاق کے تفرقے کی زحمت بھی درمیان سے اٹھ گئی۔ امید ہے کہ میری بے دریا دوا کا اثر جنابِ عالی کے عہدِ سلطنتِ آجگار پر ہمیشہ برقرار رہے۔

\*\*\*

\* ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے نالے میں قیدیوں کو مزید لذت دینے کے لیے ان کی زنجیروں میں پھریاں لگی ہوتی تھیں جس طرح آج کل عزم میں ماتم میں کام آنے والی زنجیروں میں چھوٹی چھوٹی پھریاں لگی ہوتی ہیں۔

$$\frac{۲}{۲}$$

قبلہ پرستوں کے قبلہ اور جہاں حق کے کعبہ، (خدا آپ کو) سلامت (رکھے!)  
 (یہ ہدوی) اپنے آپ کو (آپ کی) خاطر خطیر میں یا دولا نے کو وجودِ مساوت کے لوازم  
 میں سے سمجھ کر گزارشِ مزامنہ نیاز کو حصولِ مدعا کی قریب قرار دیتا ہے۔ اس خط کے حامل کا  
 وجود، محض فنی اتفاق ہے، بذاتِ خود اس امر کا گواہ ہے کہ خط میں نے کس حالت میں قرر  
 کیا ہے۔ ہر حال، (یہ ہدوی) جمعرات کے دن سودہ پہنھا۔ پختے (کے دن) تک آرام کرتا رہا۔  
 پیر کو وہاں سے کوچ کر کے، ایک رات کسی گاؤں میں گزار کر، منگل کو چلے تارا پہنھا۔ خدا کا  
 نگر ہے کہ سرورد اور بخار رخصت ہو چکے ہیں۔ آپ اپنی خاطر لطیف جمع رکھیں۔ آج رات  
 چلے تارا میں گزار کر اللہ اللہ کل صبح، جسر طرندگی، فتح پور کی تیاری کی جانے کی۔

...

$$\frac{۳}{۳}$$

قبلہ جان و دل، (خدا آپ کو) سلامت (رکھے!)  
 یہ (ہدوی) تسلیات کے بعد اپنا احوال بیان کرتا ہے۔ خدا کا نگر ہے کہ بخار اور  
 سرورد کے اثرات باندہ ہی سے رفع ہو گئے ہیں (البشر) کم نڈری باقی ہے، (جس کی) نگر نہیں  
 کہ یہی تو ہمہ خستہ حال کا وہ رفیق ہے جو میری رفاقت پر وطن سے (یہاں تک) گھر بسے ہے۔  
 اس کے حق کی لوائی کا منصب مستحکم اور اس کی ولاداری کا سایہ (یعنی اثر) فطرتِ تانیہ بن چکا

ہے۔ ہاے وہ بیل گاڑی، جسے "لڑھکا" کہتے ہیں، ضعیفی میں مجھ سے بڑھ کر واقع ہوئی ہے! پھر کدوں سودہ سے روانہ ہوا۔ چلتا تارا (وہاں سے) بارہ کو مس تھا۔ وہ آہستہ خرام، جسے "خرام" کہنا زیادہ مناسب ہے، ایک دن میں یہ فاصلہ بھی طے نہ کر سکی۔ مجدد ارات ایک گاؤں میں گزارنی پڑی۔ مشکل کو آخر شب وہاں سے روانہ ہونے اور میں خود (حق) دوپہر کے وقت چلتا تارا کی سراسے میں پہنچ گیا لیکن وہ بیل گاڑی، جسے پنشن کرنا مشکل تھا، اس وقت پہنچی کہ رات پڑے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ اسی وقت میں نے رات کی تاریکی میں، کہ نوکر چاکروں نے چراغ بھی روشن نہ کیے تھے، ایک خط لکھ ڈالا۔ کتربیونت اور آرائشی مضمون سے صرف نظر کر کے اس شکستہ تحریر پر میری معذرت قبول فرمائی جائے۔

فرض اس سرگزشت کا خلاصہ یہ ہے کہ کھینے آسمان کے ظلم سے تنگ آکر میں نے اپنے آپ کو سپردِ دریا کر دیا، یعنی وہیں سے ایک کشتی کرائے پر لی اور گھوڑا اور آدمی اور سالان، سب اس میں (جیسے نیچے) ڈالے اور "بسم اللہ مجربہ" و "مرتبہ" پڑھ کر کشتی دریا سے جمنہ میں ڈال دی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ بنارس میں قیام کرنے کی بجائے اللہ آباد پہنچ کر چند دن آرام کر کے اور سفر کی ضروریات، ہم کر کے سفر پر روانہ ہو جاؤں اور سوائے مرشد آباد بنگال کے کسی جگہ قیام نہ کروں۔ کشتی کے سفر کا حال بھی ان دو تین دنوں میں معلوم ہو جائے گا۔ کشتی ہاں کہتے ہیں کہ یہ پچیسرے روز اللہ آباد پہنچ جائے گی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ غرض کہ بدھ کے روز، دوپہر کے وقت، نامدا کی جگہ خدا پر بھروسہ کر کے میں کشتی میں سوار ہو (ہی) گیا ہوں۔

مردا مثل صاحب نے فرمایا تھا کہ جناب ملتی صاحب کے ملدوں کے نام کا خط چلتا تارا کے تانے دار کے حوالے کر دیا جائے، وہ پہنچا دے گا۔ شام کے وقت اصفان سے چلتا تارا کی سراسے میں اسباب کی بیل گاڑی اور راستے کے پھڑے جھوک کے انتظار میں دشا تھا کہ اس خرابے کا تانے دار سراسے میں آ پہنچا اور آہستہ آہستہ اوپر اوپر چل ھڑی کرنے لگا۔ میں نے ارسال خط کے سلیطے میں اس کی مدد چاہی۔ اس نے میری گزارش مان لی لیکن

\* یہاں "گڈوں" اور "گروہک" کی لفظی و معنوی رہنمائی بھی قابلِ غور ہیں۔

انتہائی بد تمیزی کے ساتھ، جہاں پہل نہ مانا اور طبیعت کو گوارا نہ ہوا کہ خطا سے دوں۔ وہیں ہر ایک غیر معروف مسافر نے جب آپ کا نام گرا ہی سنا اس نے انتہائی اگتد سے وہ خط مجھ سے مانگا۔ جہاں پہ میں نے مجت میں چند سطریں اند میرے میں لکھ کر خط اس کے حوالے کر دیا۔ قوی امید ہے کہ آپ کی نظر سے گزرے گا، لیکن میرا یہ عبودت نامہ، جو میں نے گاڑی ہاں کے حوالے کیا ہے، اگر جلد بھی پہنچے تو اس گناہ کار کے گلغلہ پہنچنے ہی پر پہنچ سکے گا۔ جہاں کہ جلد تارا سے ہاندہ اس سے کم عرصے میں پہنچنا اس کے لیے ممکن نہیں، واللہ علی کل شیء قدير (اور اللہ ہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)۔ جناب شاہ غلام زکریا صاحب اور خان صاحب الامام احمد خان، جن کے احسانات ہر خاص و عام پر ہیں، اور جناب محمد صالح علی خان المعروف بہ مرزائی صاحب کے لیے میرے نیاز مندانہ و والیانہ احترامات قائل ہوں۔

\*\*\*

$$\frac{۴}{۴}$$

ہویداد آباد و صحریت بنارس پر مشتمل:

ایسی شکایت نامہ آوارگی ہاسے من است

فہمہ دیو بدائی ہا، جدا خواہم نوشت

[یہ (ترجہ) میری آوارہ گردی کا شکایت نامہ ہے۔ دیو فراق کی داستان طالعہ لکھوں

گاہ۔]

روح و خرد کے قبلہ اور اسد کے جسم و جاں کے کعبہ، (خدا آپ کو سلامت رکھے!)

آپ کے سر پر قربان ہونے کے مراسم اور ہدم یوسی کی قضا کے مراتب کے اظہار

کے بعد یہ عرض ہے کہ اگر آج سے دو روز پیش تر ہم آپ کے حاضری میں سے غائب نہ تھے تو آج آپ کے غائبی میں سے حاضری میں۔ عالم خیال میں ہر لمحے میں اس انگلی میں پہنچا ہوا ہوتا ہوں۔ یہ دیکھیں کہ دل آپ کے ذوقِ ہم گوی میں جوش میں آگیا ہے اور میرے ہونٹ ہرزہ خوانی کے شوق میں پڑھ رہے ہیں۔ مجھ پر آئندہ کا گرہاں چاک کرتا ہوں اور گفت گو کا خوں ناپہ چکاتا ہوں۔ میں دیوانہ ہوں جو کچھ بھی کہوں سناٹ ہے اور (چوں کہ) دیکھی ہوں جو کچھ لکھوں ناقابلِ گرفت۔ شاعری وہ کنارہ کلفت بر طرف، اپنی سرگزشت کے بابِ اہتمام میں جو گفتنی ہے، وہ یہ ہے:

مضطربِ سطوتِ ہر کا، غالبِ حزی  
کائناتِ تنہا ز صفت، قواں گفت، ہاں نہ بود  
گوندِ زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است  
ما دلہذا ایں گویا ضعیف ایں گھاں نہ بود

[غالبِ حزی ہر کا سے (مض) کی شان و شوکت سے اس طرح مضطرب ہو گیا ہے گویا صفت سے اس کے جسم میں جان ہی نہیں تھی۔  
کھنٹے ہیں کہ وہ بنارس تک زندہ پہنچ گیا ہے۔ ہمیں گھاس کے اس خمیت نگے سے یہ توقع نہ تھی۔]

چلے تار ایک کیا بیٹی، یہ احوال میں وہ خطوط میں، جن میں سے ایک گاڑی بان کے اور دوسرا ایک طیر معروف نا آشنا شخص کے ذریعے، پہنچ چکا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہے اگر میری خوش قسمتی سے ان میں سے ایک۔ گاہ قبول کی برم میں پہنچ چکا ہو۔  
ہر حال، اس گھاٹ سے میں نے کشتی کرائے پر لی اور آدمی اور چوہانے کے ساتھ اس میں بیٹھ کر۔ (وہ آں حالے کہ) سعد سے اور آنتوں میں ریاچ بھر جانے کی وجہ سے سنت بے ہیں تار اور دل۔ بخار کی پیش سے سنگ رہا تھا۔ ساتویں روز۔ (قیاسی) اور آہو کے) ویرانے میں پہنچے۔

افسوس اللہ آباد پر! اس ویرانے پر خدا کی لعنت بر سے کہ وہاں نہ تو سیر کے لیے دھوا  
 ملتی ہے اور نہ کسی مذہب انسان کی ضرورت کی کوئی چیز دست یاب ہوتی ہے۔۔۔ اس کے  
 لوگوں میں نہیں اور محبت و حیا وہاں کے پیر و جواں میں ناپاب ہے۔ اس کے فواج و اطراف  
 دنیا کے لیے سرمایہ ڈوسیا ہی اور اس کی ویران آبادی [مرزا] [کھڑا] [دھونڈ]۔ [ناکھل]۔ اس  
 جہل ناک وادی کو شہر کہنا سراسر نا انصافی ہے اور اس بدقول کی بستی میں کسی انسان کا رہنا  
 کیسی بے حیائی ہے! جہنم کا صحن اس۔۔ [بومش] [سمرزین] کے مقابلے میں رکھیں (تو جھٹے  
 سے) آگ ہو جائے اور اگر ہوائے دھیر کو اس نم زدہ علاقے کی آمد می سے نصبت دی جائے  
 (تو کافی ناخوش ہو۔ چوں کہ اس (شہر) نے یہ سُن رکھا ہے کہ نیکوں کے ساتھ بدوں کی بھی  
 بخش ہو جاتی ہے، اس نے بھی اپنے آپ کو ہزار امیدواری اور بے اندازہ خواری کے ساتھ  
 بنداس کے پہلو میں لگا رکھا ہے اور گٹھ کو شفاعت کے طور پر اس کی طرف دواں کر دیا ہے۔  
 ہر جہہ کہ بنداس کی طبع نازک پر اس ڈوسیاہ (شہر) کی طرف دیکھنا بھی گراں ہے لیکن یہ اس  
 تقویت پر امیدوار ہے کہ گٹھ کا واسطہ درمیان میں ہے۔ خدا کی قسم، اگر گلٹے سے واپسی پر  
 اللہ آباد کے راستے جانا پڑا، (تو) وطن ترک کر دوں گا اور ہر گز اس راستے واپس نہ جاؤں گا۔ غرض کہ  
 پورے ایک دن رات بار بار واری کا (استقام) نہ ہونے کے جرم میں اس بھوت نگر میں گرفتار  
 رہ کر دوسرے دن جب کرائے کی پہلی ملی تو صبح سویرے گٹھ کنارے پہنچ کر ہوا کی طرح پانی  
 (درا) کو صبر کر گیا اور پائے شوق سے جانب بنداس تیر لگای کی۔

بنداس پہنچنے کے دن باوہاں فرا اور قسیم۔۔ (قیاسی: روح) آسا مشرق کی جانب سے  
 چل رہی تھی اور جاں کو توانائی اور روح کو ہالیدگی دے رہی تھی۔ اس ہوا کے امہاز نے میری  
 مٹھی بھر خاک کو قلع کے جھنڈے کی طرح بلند کر دیا\* اور اس ٹھنڈی ہوا کی سستی نے میرے  
 جسم کی مادی کم زوری ہی رفع کر دی۔

کیا کہنے فواج بنداس کے، کہ اگر اس کو قرطول قضیفی کے سیب قحط قلب عالم کموں

\* یہاں لفظ آگے چبھے ہو گئے ہیں: "امہاز آں شستہ ہوا طہرام را۔" ہوتا ہے ہاچھے  
 نہ: "امہاز آں ہوا شستہ طہرام را۔" ترجمہ اسی طرح کیا گیا ہے۔



تو ہا ہے اور کیا کہنے ہیں اس ہستی کے جوانب کے، کہ اگر اس کو فرط سبزہ و گل کے باعث  
 دُورے زمین پر جنت جانوں تو ہا نہ ہے۔ اس کی آب و ہوا اموات کے جسم میں جان ڈالنے کی  
 خدمت۔ (قیاسی: انہام دستی ہے) اور اس سرزمین کے دُورے دُورے کی یہ خاصیت ہے کہ  
 جو ہر مختلطیں کی طرح راست چلنے والوں کے پاؤں سے چمے ہوئے تیروں کی نوکوں کے  
 کاشٹوں کمال لیتا ہے۔ ہماری نظر میں اگر گلتا اس (بنارس) کے کھسوں سے اپنا سر نہ رکھتی  
 تو اس تھنس کی اہل نہ ہوتی اور اگر سورج کا اس کے درو دیوار سے گزر نہ ہوتا تو وہ اس قدر  
 فروزاں اور تاب ناک نہ ہوتا۔ گلتا اپنی لہروں کی روانی سے گویا۔ مروطاں ہے، جس سے  
 ساکنانِ طہر اس کے گھر سیلابی ہو گئے ہیں اور پری پھر گلاب سبزہ رنگ کے جلوے سے ہدیوں  
 کے کھیل جانے اجالی!

اگر میں اس شہر کی، ایک سرے سے دوسرے سرے تک کی، عمارت کی کثرت  
 کا بیان کروں (تو گویا یہ) سراسر مستقوں کے عبادت خانے ہیں اور اگر [از۔] اس کی انواع  
 کے سبزہ و گل کی ایک فصل بھی پڑھوں (تو یوں لگے جیسے) بیاباں و بیاباں بہارستان ہے۔

محالی اللہ بنارس، چشم بہ دُور

(بشتِ خرم) و فردوسِ معصوم

خس و جادش گلستان است، گوئی

عبادش جوہر جان است، گوئی

سروشِ پاسے تحتِ بُتِ پرستان

سراپائشِ زیادتِ گاہِ مستان

بنارس را کسی گفتہ کہ جہیں است

ز مسجِ گلگ جیش بر جہیں است

بخوش بدکاری طرزِ وجودش

ز دلی ی رسد ہر دم درودش

بنارس را تو گوئی دید در خواب  
 کہ می گزید ز نهرش در دہن آب  
 حدودش گفتی آئینی اوب نیست  
 و لیکن خطہ گر باشد، جب نیست  
 فرنگستان حصہ بے نقاب است  
 ز خاکش رزہ رزہ آفتاب است  
 بُنائش را ہیولی شطہ طور  
 سراپا نوید اینچ چشم بد دور  
 میانہا نازک و دلہا توانا  
 ز نالوائی ہارِ خویش دانا  
 تبسم بکے در دلہا طبعی ست  
 دہن با رنگِ گھمائی ربتی ست  
 بلند اختلاوہ شکلی بنارس  
 بود بر لہجہ او اندیشہ بنارس

[سمان اللہ، بنارس کو خدا تعالیٰ سے محفوظ رکھے۔ یہ بشتِ سرسبز اور بشتِ معمور

ہے۔

اس کے جھاڑ بھٹے اور بھی بہتر نہ گلستان کے ہیں (اور) اس کی گود گویا جوہر ہاں ہے۔  
 اس کی اطراف بے حد بہتوں کی تحت گاہ ہے اور وہ (بذاتِ خود) سرناہا مستوں کی  
 زیارت گاہ ہے۔

کسی نے کہا کہ بنارس چین (کی مانند) ہے، (تو اس ٹھوسے سے) بنارس کے ماتھے پر  
 گلاب کی سو جوں سے گلئیں پڑی ہوئی ہیں۔

اس کے طرزِ وجود کی خوش ہر کاری پر دلی بھی ہر کے درود بھیجی ہے۔  
 یوں لگتا ہے کہ اس (دلی) نے بنارس کو خواب میں دیکھ لیا ہے، (جیسی تو) اس کی  
 نر سے (دلی کا) وہیں ہر آب ہے۔  
 (اس کی خوبیوں پر) بہت زیادہ حسد کرنا آئینی لوب کے عکاس ہے، البتہ رکھ کرنا  
 حیران کن نہیں۔

(یہ) حسی بے کتاب کا (وہ) فرنگستان ہے، جس کی خاک کا فرقہ ذرہ آکتاب ہے۔  
 اس کے حسین شہرِ طور کی صورت ہیں۔ خدا انہیں نظریہ سے بھائے، سراپا نورِ انبوی  
 ہیں۔

ان کی کمر میں نازک (لیکن) دل توانا ہیں۔ وہ نوافی میں بھی اپنے کام میں (بڑے) توانا  
 ہیں۔

ان کے دلوں میں ایک نظریہ مخمّم رہتا ہے (اور) ان کے وہی فصلی رنج کے پھولوں  
 کے لیے باعثِ رکھ ہیں۔

بنارس کا مرتبہ (اتنا) بلند ہے (کہ) اس بلندی پر (انسان کی) فکر نہیں پہنچ سکتی۔]

اس تماشا گاہ کی دل فریبی کے طور سے غمِ مسافرتِ دل سے موبہو گیا ہے اور اس  
 بُستِ خانے کے لفظِ نادرِ ناعوس کی کثرت سے دلِ جمومِ جموم کر (مستانہ وار) نعرہ زن ہے (سیرا)  
 ذوقِ (حسن) بادہ تماشا سے ایسا بدست ہوا کہ وارِ فحشی میں یاہوِ طن (کی شمع) بجادی اور اس جگہ  
 کے کنارے کی کیفیتِ دل پر اس حد تک غالب ہو گئی کہ دلی کے لیے سوائے طاقِ لہیاں  
 کے (اور کوئی) جگہ نہیں رہی۔۔۔ (اگر) یہ اہم معجزہ پیش نہ ہوتا اور (سیرا) دلِ شامتِ ابد اسے  
 رنجی نہ ہوتا تو سب درگاہِ وری کو خیر باد کہتا اور قسحِ قرّ ڈالتا اور (ماتھے پر) ہتھ کھینچتا اور  
 (گگے میں) زنگار ڈالتا اور اس بدست کے ساتھ گنگا کنارے پیشا رہتا بلو قے کہ (سیرے) جسم  
 سے) ہستی کے آکائش کی گودِ دل نہ جاتی اور میں ایک قطرے کی صورتِ دیا میں ختم نہ ہو  
 جاتا۔ اس رزمِ آہو میں ہم رکھتے ہی بغیر کسی علاج کے اور بغیر کوئی دوا کھانے، نئے عوارض

کی تعلیق ہوتی رہی، بلکہ وفاق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک حد تک اصل مرض میں ہی اللہ ہو گیا۔ روزمرہ کے مراعات میں ہے جس قدر بھی فراہم ہو جاتے ہیں، وہ حفظِ صحت کے طور پر ہیں، ورنہ اب نہ تو عقلی ماضی منظور ہے، نہ رعایتِ حال۔

قبل کا وہ اکھیں جناب کی خاطر اُدھر میں یہ ٹھکانہ گزرتے کے طالبِ اپنی شوریدہ سری اور پریشان نظری کے باعث بنارس میں شد کی کبھی اور دہلی کے گھر سے کی طرح پھنس گیا ہو گا۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھ جیسے فلک زدہ کے پاس کسی جگہ قیام کے لیے ساز و سامان کہا اور تھریج کے لیے دل و دماغ کہاں۔ یہ قیام تو مجھے (بمہر آ) اُن دواؤں کی فراہمی کی خاطر، جو اکثر میرے استعمال میں رہتی ہیں، اور ہر دے سلمان مینا کرنے کے لیے، جس کی ہاڑے میں ضرورت تھی، کرنا پڑا۔ پانچ دن سراسے نیرنگ آباد میں، جو ”سراسے نورنگ آباد“ کے نام سے معروف ہے، صنایع ہوئے۔ اس کے بعد اسی محلے میں اسی سراسے کے چھ ایک مکان مل گیا۔ جہاں وہ اسی مکان میں، جو بغیل کی قبر سے زیادہ تنگ و تاریک ہے، میں نے رخت سفر کھول لیا ہے اور اختیاری کے بستر پر آ پڑا ہوں۔ نہایت کی ایک دوسرے سے آسیرش۔ [ناکمل] آوارگی کی چادر پر رقص ہو نہ کاری وقت مانگتی ہے۔ کم از کم چار بھتوں میں سے اس میں۔ غفلت میں گزرا ہوا یہ جفتہ بھی انہی ایام میں شمار ہو گا۔ فی الوقت (انتخابِ راہ سفر کے باب میں) دشت و دریا کے درمیان، گویا پانی اور آگ کے بیچ، مستحکم ہوں۔ کبھی تو خیال آتا ہے کہ عظیم آباد تک خشکی کے راستے جایا جائے اور وہاں سے کشتی کرانے پر لی جائے اور کبھی ہی چاہتا ہے کہ یہیں سے دریا کے راستے چل دیا جائے۔ اس حال میں مجھے جناب سے یہ امید ہے کہ آپ آوارگانِ دشتِ بلا کی غم خواری فرمائیں اور ایک فوری فوارش نامہ انگریزی ونگل کے ذریعے ارسال فرمادیں تاکہ اس سے جناب کے مزاجِ اقدس کے بارے میں تفصیل سے آگاہی ہو۔ بجائے اس کے کہ (صرف) آغازِ مکتوب میں خیر و مالیت تحریر ہو۔ وہ ماضی و ماضی کا ہانسنے والا آگاہ ہے کہ میرا دل اکثر مہموم (ہی) کی جانب گھبرا رہا ہے۔

انشاء اللہ العزیز، وہ عریض، جو میں آپ کے مشورہ سادہ رقم کے جواب میں لکھوں گا،

پورے طور پر حالی تاہم رخصت و کوائف طور طریق سفر ہوگا۔ ہر چند کہ مجھے اپنی (ساجدہ) درخواست پر انتہائی اصرار ہے، لیکن دل بے کسی و گم نامی کی حرم سے بے حد زخمی ہے کہ جس گوشے میں آ پڑا ہوں، یہ ایک بڑھیا کی کوٹھری ہے جو خود روٹھی چرائی کی محتاج ہے، اور اس کے خرابے کی پوچھ گچھ کرنے والا کوئی نہیں۔ اجڑے گاؤں کی طرح، خوف خراج سے، نہ اس کے پہلو میں کوئی مشورہ باز ہے، نہ (ہی) اس کے قریب کوئی شاہ دار محل (چنانچہ سمجھ میں نہیں آتا کہ) پتا کیا تحریر کیا جائے! بیک خیال خود ہی نامہ بر کیوں نہ ہو وہ آخر کس۔ (قیاسی: دروازے پر) اس کو دھونڈنا ہوا جائے گا، (لہذا) میرے عہدوم، آپ خط کو، مع کتب الیہ، خدا کو سونپ کر اس پر یہ پتا لکھ دیں: محلہ نورنگ آباد، حسب سراسے نورنگ آباد، قریب حوطی گوسی خان ساناں، حوطی مشالی و میاں رمضان میں پہنچ کر امد اللہ قریب الوطن نوادہ کو ملے۔

امید ہے کہ انگریزی دکان کے قاصد دماغ کے تیر کی طرح اپنا نشانہ خطا نہیں کریں گے۔ اس ہڈیاں سرائی اور پریشان نوائی کا عذر خط کی ادھائی میں کر چکا ہوں۔ اس باب کا ایک حصہ اگر اب دہرایا جائے تو "تذکرہ گناہ بد تر از گناہ" کے مصداق اس طعنے سے بڑھ کر ایک دفتر معذرتِ فضول کے اعادے کے لیے ہا پیے ہوگا۔

پیشانی عفو ترا بد میں نہ سازد جرم

آنند کی بد ہم خود از دشمنی بخشما

[تیسری درگزر کی پیشانی ہمارے جرم سے گلے آلود نہیں ہوتی (کہ) آنند مکسوں کی خرابی سے کبھی نہیں وحشت لاتا۔]

(دعا ہے) آپ کی عمر و دولت، عرصہ جاوید کی لھتا میں... حیاتِ ابدی کے عشرت کدے میں جڑواں پنوں کی طرح رہیں۔ حضرت شاہ محمد زکریا صاحب اور خان صاحب۔ اور مرزائی صاحب کی خدمت میں میری نیاز مندیاں اور آرزو مندیاں قبولیت کے رنگ سے برہ یاب ہوں۔

جناب فیض مآب، دنیا اور آخرت دونوں کے قیل و کھیل، مدظلہ العالی!

ایک عرصہ ہو گیا ہے کہ میری سانس اُس قبلہ رستاں کے فراق کی چپش میں شعلہ خیز اور جھینپ خیال اُس آستان کی ہوس میں سجدہ ریز ہے۔ افسوس، کہ میرے اور اُس پانی کے درمیان، جس سے شوق کی خطرناک آگ بجھائی جا سکتی ہے، سات سمندر مائل ہیں اور اس درگاہ کا وہ پتھر، جسے اُس کی عبودیت کی نماز کی ٹہر قرار دیا جا سکتا ہے، کبھے جتنا دور ہے۔ آپ نے میری بنارس کے دور کی خاک فیشنی میں خط تحریر کر کے جس شقت کا اظہار کیا تھا، اس نے میری چشمِ منت کو ایک روشنی، اور نبتِ چشم کو ایک بلندی، عطا کی تھی۔ اس کے جواب کی ترقیم کی سادت کو وقت کی مین جملہ مقتضات میں سے سجدہ کر اور ایک ورقِ آپ کے خدام ذی احترام کی خدمت میں، لکھ کر، (اس لکھو نے) یہی خشکی کے راسخہ عظیم آباد کے سفر کا ارادہ کیا۔ مختصر یہ کہ بزرگوں کی سالوں کے فیض کی توجہ کی برکتوں سے، عہدِ راہ کی طرح، کوہ و بیاباں میں امتحان و خیزاں، ہر کام پر کاستے اور پتھر کی تلواروں کی دھار سے نگرانا اور کبھی راتوں کی سردی کی شدت سے افسردہ ورنہ اور کبھی گردشِ ایام کی الم زندگی سے نالک، بدھ کے دن، جو تھی شعبان کو ایک قدر سے دن چڑھے گلشنِ ہنسنا۔ میں اُس بنا احسان (جیتانے) بخشے والے کی فریب پروردی پر ناز کرتا ہوں کہ ایسی جگہ ایک خاطر خواہ مکان، جس میں ہر قسم کی راحت و آسائش موجود ہے، جس میں آرزوگوں کے دل کی وسعت کے مطابق فضا بھی ہے اور جس کے اندر دنیا طلبوں کی حرص کے وہن کی طرح (کھلا ہوا) بیت اللہ بھی ہے اور جس کے ایک گوشہ صحن میں شے پانی کا کنواں بھی ہے اور جس کی پست پر اہل ثروت کے لائق ایک آرام گاہ بھی ہے، بغیر کسی تلاش کے، پناہ کسی سے پات کیے، کوئی زحمت اٹھانے بغیر اور کسی کا احسان لیے بغیر ہر رو بہ راہ وار کھانے پر مل گیا۔ اور (اس

طرح) انسانوں اور جانوروں دونوں کے لیے راحت کا باعث ہوا۔ دو روز میں سفر کی کسات دور کر کے اور آپ کے عمارتی خط کو مشعلِ مدعا بنا کر بجلی بندر جانے کے لیے کشتی میں بیٹھ گیا۔ نواب صاحب (علی اکبر خان) کے دروازے پر پہنچ کر پھٹے میں اس ایوان میں گیا جہاں جناب سید الشہداء علیہ التسلیم کی صریح رکھی ہوئی ہے۔ اور زیارت۔ جب نواب صاحب کی قسمت کے قریب پہنچا تو وہ فرطِ محارت سے اٹھ کھڑے ہوئے... وہ تھارے استکار میں بہت دن گزر گئے۔ جب میں نے تھارے استکار کی کیفیت پر بھی (قیاسی) تو یہ معلوم ہوا کہ لوگ ان سے میرا تہاڑ محارت کراچے ہیں) اس معنی گل۔ نواب صاحب کو پہنچا چکے ہیں اور اس طرح صدی طغلات سے پھٹے ہی مجھ سے معنوی محارت کراچے ہیں۔ طغلات کے دن۔ درمیان میں نہیں آیا۔ دو عین گھنٹے بیٹھ کر اپنے غم کے میں واپس آگیا۔ دو روز کے بعد کہ بارہ ویش شب فطین ہوا، دو دن اور ایک رات صحبت رہی، احوال کے ساتھ مدعا سے سُر پر گفت گو ہوئی۔ میں نے مقررے کا حال غصیلے بتایا۔ انھوں نے مجھے کوئی ایسی امید نہیں دلائی جس پر خوش ہوا ہائے۔ نہ ہی مجھے ناسید کیا کہ اس مقصد سے دست بردار ہوا ہوں۔

جہاں بے صبر و گیتی دشمنی و دلدل مستحق

مرا بر آرزو ہاے سنائی خندہ می آید

دنیا بے صبر، جہاں دشمنی اور محبوب بے ہوا ہے۔ مجھے سنائی کی آرزوؤں پر ہنسی

آتی ہے۔

میری بد بختی کی آشنائی بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ ان ہی دنوں نواب صاحب ممدوح کا بجلی کے کلکٹر کے ساتھ اس زمین کے لوہ، جو لام ہاڑے کے لیے وقت ہے، اختلاف ہی نہیں، بلکہ جگہ اور پیش ہے۔ چنانچہ وہ اپنی فکر میں سرگواں ہیں۔ یہ بات نہ صرف یہ کہ نواب صاحب ہی نے یہ نفسِ نفیس بھی، بلکہ مسلسل اور متواتر دوسروں سے بھی سنتے ہیں آتی۔

ہم را ماتنی حسرتِ دنیا دیدم

جہاں بہ عشرتِ کدہ گبر و مسلماں رفتم

[میں نے سب کو حسرت دنیا میں ماتم ہی کرنے دیکھا، جب میں آتش پرستوں اور مسلمانوں کے حسرت کو دے میں گیا۔]

نواب احمد بخش خان کی موت کی خبر تو آپ نے سنی ہی لی ہوگی۔ ہر چند کہ نواب صاحب کے جسم خاکی کے فنا ہونے سے نفسِ مقدسہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچتا ہے، پھر بھی میں از خود فتنہ و کیفیات میں مبتلا ہوں۔ اول تو یہ کہ جو خطرہ مجھے مستقبل میں تھا، وہ آج ہی پیش آ گیا ہے، یعنی جائیداد کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا۔ دوسرے یہ کہ (مستقبل کی) فتح کے بعد جس مسرت کا تصور تھا، وہ سرِ اسرار ہی ہو گیا، یعنی غاصبِ زبردست سے استقام لینا اور پھر مظلوموں میں اس پر ناز کرنا۔

(اے) میرے خطا معاف کرنے اور عیب پوشی کرنے والے، (خدا آپ کو) سلامت (رکھے!)

آپ کے اس نوحہ پر غلام سے بابِ سخن میں دو غلطیاں ہو گئی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ میں نے بتا دی ہے جو غزل بھیجی ہے اور جس کا مطلع یہ قرار کیا ہے:

اے بعددِ آپ ہے دولتِ زما بارے

اے قدرِ گراں نیو نہ ز میراے

[تیرے دل کو ہماری آہ سے جو ایک بار صدہ پہنچا ہے (تو) بیمار کا نالہ اتنا گراں بھی نہیں ہوتا۔]

اسد کرتا ہوں کہ جنابِ عالی مطلعہٴ کور کو بھلا کر یہ دو مصرع اس کے نظم البدل کے طور پر لکھ لیں گے دوسرے یہ کہ خدا گواہ ہے۔ وہ قصیدہ، جو میں نے آغازِ میر کی مدح میں لکھا ہے، میرے خاندان کے لیے داغِ بدنامی ہے۔ اب لطف یہ ہے کہ ان ایک سو دس اشعار کو کاغذ سے مٹا بھی نہیں سکتا۔ (چہل کہ) نواب مرشد آباد بھی سیدہٴ لوسے ہیں، اس قصیدے کو ان کے نام سے شہرت دے رہا ہوں، اگرچہ میں ان کی خدمت میں اب تک حاضر نہیں ہوا ہوں... لیکن ہمایوں جاہ کی مدح کرنا مجھے گوارا ہے۔ قریح کرنا ہوں کہ جب تک ممدوح کے نام



سے مختص اشعار کو... (قیاسی: اس قصیدے میں شامل نہ کر لوں) یہ قصیدہ کسی کو نہیں دیکھائیں گے اور بزرگوں کی طرح اپنے چھوٹوں کی عیب پوشی کریں گے۔ وہ نوازش نامہ کہ... (قیاسی: آپ مجھے ارسال کریں) اُس پر پتا اس طرح ہونا چاہیے۔ شہر گلشن، قریب چیت بازار، در شملہ بازار، نزدیک تالاب، اسد کو سٹ۔ آرزو سے قدم بوسی کے علاوہ مزید کیا عرض کروں! محمد اسد اللہ

\*\*\*

۶  
—  
۳۰

میر سے قبلہ و قبلہ گاہ، (خدا آپ کو) سلامت (رکھے)۔  
دنہائے آداب و تسلیم و کورنش کے رسمی شکلات بندی کی اسات کے مذاق پر گوارا نہ پا کر اور نقدِ اخلاص کے حوالے کے مقصد کے شایان شان نہ دیکھ کر (یہ لدوی) (جناب عالی کے) انہوں اور چھوٹوں کی طرح تسلیات پیش کرتا ہے اور عرض گزار ہے۔ نوازش نامہ کا پہنچنا۔ جناب کے حکم کے مطابق مجھ خیر کی مزارِ کثیر (انوار) جناب اقصی القصات پر حاضری کا اُس خط کے لحاظ سے، جو میر کرم علی صاحب کے نام تھا، معلوم ہو گیا ہو گا۔ خط کے لکھنے میں تاخیر سبیل کی وجہ سے نہیں تھی۔ دراصل میں اس بات کا منتظر تھا کہ کوئی قابلِ قریب بات ہو (تو خط لکھوں)۔ ذوقِ دم بوسی سرا یہ اختیارِ قریب ہو۔

قبلہ گاہ، جناب کے گرامی نامے کے پہنچنے پر۔ بیگم صاحبہ کی عرض داشت اور قبلہ۔ انٹالی میں ایک دوست کی رہ نمائی میں ہجومِ مرحوم کے دولت خانے پر پہنچا۔ سب سے پہلے مرزا پر پہنچا اور تا قریب دہائی اور اس نامے کو یاد کر کے۔ کچھ دیر لہجی بے کسی پر رویا۔ خط کو ایک حرم کے ذریعے حرم سرا میں بھیج دیا۔ ایک صاحب، بنام مولوی غلام علی صاحب، برآمد ہوئے۔ اور مجھے حرم سرا میں لے جا کر بدو سے کے چمکے بشادیا۔ جناب بیگم صاحبہ نے عزتاً

برایہ راست مجھ سے بات چیت کی اور قدر سے آپ کا حال بھی پوچھا اور کچھ سیری آوارگی کا مقصد بھی معلوم کیا اور فرمایا کہ کہ میرا بیانا مولوی ولایت حسنی (اس وقت) موجود نہیں۔ وہ جس وقت بھی آیا تو آپ کے پاس پہنچے گا اور آپ کے شہر نے کے لیے اسی عمارت میں انتظام کر دے گا۔ شملہ بازار شہر سے اور سرکاری دفاتر سے دور ہے۔ اس کے بعد موصول کے پاس جانے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا۔ میر ولایت حسنی صاحب تاحال دور سے سے واپس نہیں آتے ہیں، (الغرض) مقصد آج صبح بتا رہا تھا کہ مولوی ولایت حسنی آج گلشنہ پہنچ جائیں گے اور آج سوال کی چند عموں اور ہٹنے کا وسط، یعنی منگل ہے۔ میں نے کائنات کی تقویٰ حاصل کرنے کے لیے خصوصاً اور سرکار کے دفتر میں دستاویزات بطور شہادت پیش کرنے کی خاطر عمو ایک عرض داشت، جو ہزاری پچھلے بیس سال کی چارہ جوئی اور فیصلوں کے خاکے پر مشتمل ہے، لکھ لی ہے۔

کل مہینے کی تیرہ تاریخ اور پیر کا روز تھا اور یہ دربار کا دن ہوتا ہے جب تمام سزا اور دکا اور درخواست گزار حاضر ہو کر ایک حاکم، موسوم بہ فریڈ صاحب، کی کہ اس درگاہ کے دربان کی حیثیت ہی نہیں رکھتے بلکہ ہمارے خود دروازہ ہیں، خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ عہد سے کے لحاظ سے وہ درخواستوں اور منصوبوں کے درمیان، بلکہ سارے اہل حاجات و صاحبان کو نسل کے درمیان ایک واسطہ ہیں۔ ہر قسم کی عرائض پہلے ان کے پاس پہنچتی ہیں اور وہ ان کا انگریزی میں ترجمہ کر کے صاحبان کو نسل کے پاس پہنچاتے ہیں۔ غرض کہ لدوی بھی اپنے قطعہ عرض داشت کے ساتھ، جو نواب گورنر (جنرل) کے نام تھا، حاضر ہو گیا اور اطلاع کے بعد حضوری کی اجازت پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فریڈ صاحب تعظیماً اٹھے اور مجھ سے بدل گیر ہوئے۔ مختصر آئیں نے ضریح احوال کی۔ جب میں نے اپنے بھانجے نصر اللہ بیگ خان کا نام لیا تو فرمایا، "ہاں ہاں، انہیں تو ہم جانتے ہیں، شہزاد نصر اللہ بیگ خان سے کیا رشتہ ہے؟" میں نے عرض کی کہ میں ان کا سگا بھتیجا ہوں۔ مختصر یہ کہ وقت کی ضرورت کے مطابق جو کچھ مفید مقصد تھا، میں نے کہا۔ انہوں نے استفادہ کیا، "نواب گورنر کے لیے کوئی درخواست لائے ہو؟" میں نے وہ قطعہ درخواست گریبان قبا سے نکالا اور انہیں پیش کر

دیا۔ چنانچہ ریڈیو سنٹ کی عدالت سے پہلے رجوع نہ کرنے کا حذر تسلیم کر لیا گیا۔ چوں کہ اگر یہ حذر قبول نہ ہوتا تو (فریڈ صاحب کی عدالت میں) میری درخواست منظور نہ ہوتی، بلکہ فریڈ صاحب موصوف کو اس بات کا اختیار ہے کہ جس مقدمے کو کوئٹہ میں قابل سماعت نہ جانیں (برائے راست) بذمہ کی خود جواب دے دیں۔ ہر حال پہلی مشکل ہی ایک خطرناک ٹھیلہ اور خوف ناک ڈھنگا دینے والی جگہ تھی کہ جس سے میں، بغض خدا، خیر و خوبی سے گزر گیا اور میری درخواست منظور ہو گئی۔ رخصت کے وقت انھوں نے عطر دان اور پان دان منگوا کر اپنے دستِ حاس سے مجھے عطر اور پان عطا کیا اور کسی سے سروہد گھرے ہو کر میرا سلام قبول کیا۔

اب خیر بھئی تھہرے کا تماشا ٹی ہوں کہ۔۔۔ (قیاسی: پردہ غیب سے کیا عہد پذیر ہوتا ہے۔) مجھے تو ہرگز بھی اس کا گمان نہیں تھا، بلکہ جو کچھ ہوا اس کو ٹرووں کے زندہ ہونے کے عالم کا ایک اہم کلمہ سمجھتے ہیں۔ اس سے پہلے۔۔۔ اور مطلق۔۔۔ (قیاسی: کی تائید سے عروس کام بائی نے اپنا رخ میری طرف کر کے) میرے مغزیاں کو مسرت کی خوش بو سے معطر کر دیا۔ فی الحقیقت۔۔۔ گلارستان مقاصد ہیں۔\* اس ایہام کی وضاحت اور اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ میرزا یوسف کو۔۔۔ (قیاسی: دیوانگی کی وجہ سے اپنے جسم و جاں کا ہوش نہیں) ماوراء لنگے رہتے، بمنوہوں کی طرح چین سے ایک جگہ نہ بیٹھ سکتے، نہ ماں کو ماں۔۔۔ (قیاسی: اور نہ بہن کو بہن) سمجھتے۔ ستائیسویں رمضان کو ایک خط دہلی سے پہنچا۔ میں نے جیسے ہی لفظ کھولا ایک کاغذ کے ٹکڑے پر نظر پڑی۔۔۔ (قیاسی: میں نے بہانہ لیا کہ) میرے بھائی کی تحریر ہے۔ جب میں نے اطمینان سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ (میرزا یوسف ہی کا) خط ہے، جو اس نے خود تحریر کیا ہے اور القاب و آداب کو۔۔۔ پوری ہوش مندی کے ساتھ طوطیِ خاطر رکھا ہے۔ میں خوشی سے اچھل پڑا اور ناچنے لگا اور فرط مسرت سے زارہ قطار رونے لگا۔ جب ذرا ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو منہ بالا اور اپنی خانم کے خط کی طرف توجہ دی۔ لکھا تھا کہ تمہارے (جانے کے) بعد میرزا یوسف کے جنوں کے شور نے۔۔۔ (قیاسی: ہم سب کو سخت بے چینی دکھا) جس کا ہمیں پہلے سے ڈر تھا، اور ہمارے شب و روز اس کی چیخ پکار اور مار پیٹ میں منت

\* اس جگہ کوئی ایسا جملہ ہو گا جس سے یہ معلوم ہو کہ قسمت یاوری کرنے لگی ہے۔

بد مزہ گزرے۔ سرکارِ شاہی کے ٹیلی ہانوں میں سے ایک ٹیلی ہان نے، جو محل کی ایک خادمہ کے ذریعے یہاں پہنچا تھا، اس کا علاج کرنا شروع کیا۔ اس نے جنون کو ہلکے کا اثر قرار دیا اور اس کی لٹائیاں بھی بتائیں چنانچہ اس نے شہرِ شاہ کے باہر ایک درخت کی جڑ کھودنے اور ایک کنواں تلاش کرنے کو کہا۔ وہاں جو ہم نے کھدائی کی تو جو جو چیزیں اس نے بتائی تھیں، وہاں سے ملیں۔ غرض کہ پانچ ماہ کے علاج میں یوسف کی دھنسنے بیداری طبع ہو گئی۔ چنانچہ اس قدر ہوش و حواس برقرار ہو گئے ہیں کہ کپڑے پہنے، ستر پوشی کرے، بول و براز سے احتراز کرے، کھانا دسترخوان پر کھائے اور بیوی، بیٹی اور ماں کو بیوی بیٹی اور ماں سمجھے۔ یہ باتیں خانم کے خط سے بھی معلوم ہوئیں اور پھر اس کے اپنے خط نے اس کی ہوش مندی کی تصدیق کر دی۔ خدا کی قسم، اس کی صحت جیسے پدیدِ مرحوم کے زندہ ہو جانے سے عزیز تر ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ بھی میری گزارش پر اس کو اپنا فرزند سمجھ کر خوش ہوں گے اور دعا کریں گے کہ اس کی بائی وادھگی بھی راسخ ہو جائے اور میر کرم علی صاحب کو اس درود سے آگاہ کریں گے۔

مگر کے کلہ حق قہل گوید

کلہ قویہ کلہ چہل گوید

[اگر کوئی خدا کا انسانی کلہ گزار بھی ہو، (بھلا) کلہ ادا کرنے کی قویہ کا کلہ کس طرح لدا

کرے گا!]

...

۷  
—  
۱۸

قلید گاہا، بے کساں پناہا!

دو ماہ پر بھی دس روز سوا ہو گئے ہیں کہ جنابِ مالی کے گراہی نامے کی سیاہی چشم منتظر

کے لیے سرسبز نہ بنی۔ عرض داشت ڈی الجہ کی پہلی تاریخ کی لکھی ہوئی اور یاد مذکور کی آٹھویں تاریخ کا لکھا ہوا خط، کہ قدوسی مولوی ولایت حسن صاحب کے خط ہی میں مکتوف تھا، کس طرح کہوں کہ تلف ہو گیا۔ اور ان میں سے ایک بھی آپ کی، روبرویت کا اثر رکھنے والی، نظر سے نہیں گزرا۔ کاش، میں متعلق کے گھمان کا نقش جناب عالی کے دامن التفات پر بنا سکتا۔ میں ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ جاتا اور دل پریشاں خیالی کی کش مکش سے عاجز نہ ہوتا۔ ایک بار تو میں انتباہے اضطراب میں دوڑا ہوا مولوی ولایت حسن صاحب کی خدمت میں بھی گیا۔ آپ کے گراہی ناسے کے جواب (قیاسی: نہ) پہنچنے کا ایک سوہوم خوف سادل میں تھا۔ (وہاں پہنچ کر) معلوم ہوا کہ عہدوم موصوف بھی میری طرح ہی آپ کے خط کے منتظر ہیں۔

اگرچہ آپ کے حالات سے لاعلمی کے درد کو دوا نہ ملی، لیکن خدا کا ٹکڑا ہوا لانا پہل کے اس نے مجھے دھجک کی تیش کے دوزخ کے دایر سے نہ جھلایا۔ قصہ مختصر، جو کچھ بھی گزرا تھا، ان دونوں خطوط میں، اس اختصار کے ساتھ جو تفصیل پر حاوی ہے، آپ کے لیے لکھ بھجوا تھا۔ منازل مقصد کے عنوان کا اختتام اس خبر پر تھا کہ میری عرضی کو فصل میں پہنچ گئی ہے لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں ملے۔ بارہ خبر یہ ہے کہ خدا کے فضل سے اراکین کو فصل نے میرا مستندہ قبول کر لیا ہے، لیکن (ساتھ ہی) انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ قانون کے مطابق اس تالش کو ریڈیٹنٹ کی عدالت میں دائر ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ سفر کی استطاعت اور واپسی کی تاب و توان مجھ میں نہیں۔ انھوں نے حکم دیا کہ (مذمبی) ہمیں رہے، لیکن وکالتاً ریڈیٹنٹ دہلی سے رجوع کیا جائے، (جہاں چ) میں نے رفیقان وطن میں سے ایک رفیق کو ایک خط لکھا اور اس سے مدد مانگی۔ اس نے قریب نواری کی اور اس کام کے لیے مستند ہو کر (میرے لیے) ایک وکیل کیا اور مجھے (اس کی) اطلاع دے دی۔ اب میں نے اس کے نام اختیار نامہ لکھ کر اور اس کے ساتھ وہ تمام کاغذات، جو بھیجنے ضروری تھے، اس کا ضمیر بنا کر اس مستند دوست سے موسوم عریضے میں، جو مجھ پر مجھ سے زیادہ مہربان اور اسیر انصاف طلبی میں مجھ سے زیادہ قواد کا جاننے والا ہے، لپیٹ کر شاہ جہاں آباد بھیج دیے۔

تا درمیانہ خواستہ کردگار بہت!

[اب دیکھئے، خدا کی مرضی کیا ہے!]

اسبابِ ظاہر سے تو، کہ اہل عقل اسی پر بات کرتے اور کم فہم اسی سے حصارِ صورت ترتیب دیتے ہیں، حالاتِ بستی پر نتیجہ ہوتے نظر آتے ہیں۔ (اس سلسلے میں) دو عجیب لطیفے اور عجیب نکات ہیں پہلا تو یہ کہ دارالحکومت سے (میرے) مستعدی کے خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ احمد بخش خان کا بیٹا، جو اپنے مرحوم باپ کا ولی و وارث ہے۔ زندانہ و۔ (قیاسی؛ مستانہ) زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے طور طریق کی شوریہ کی حکام اور اس کے اپنے اہل قوم میں ناپسندیدہ ہے۔ (یہاں تک کہ) شہر کے عام لوگ بھی اس سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ (قیاسی؛ دوسرا امر یہ کہ) امراے گلشن میں سے ایک صاحب کی جواں مری اور کوشش سے صاحبانِ عالی شان میں سے ایک حاکم بنام کول بروک صاحب کی تحریر۔ (قیاسی؛ میں نے کسی صورت حاصل کر لی ہے اور اس کو) دوسری دستاویزات کے ساتھ دہلی بھیج دیا ہے۔ لیکن (افسوس یہ ہے کہ) انتظامِ حسین خان کا، جو کول بروک صاحب کے مثنیٰ ہیں، کوئی دوست گلشن میں نہیں ملے۔ واضح رہے کہ انتظامِ حسین خان۔ مولوی عزیز اللہ خان نامی ایک بزرگ کے صاحب زادے ہیں۔ اگر اتفاقاً آپ سے ہاں پہچان ہو تو ایک خط ان کے نام لکھ کر مجھے ہرگز نہیں، بلکہ (براہِ راست) مکتوب الیہ کو دہلی بھیج دیجیے۔ خط کا مضمون یہ ہوا کہ اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ کا جو مہتممہ ہندت، بیرالہ وکیل کی وسالت سے ریڈیو ٹی کی بھری میں دہلی پہنچا ہے وہ میرا الہنا ہے اور بغرض حال اگر آپ کی انتظامِ حسین خان سے شناسائی نہیں تو حکیم سلامت علی خان سے ان کے نام ایک خط لے کر ان کو بھیج دیں، لیکن خدا کے واسطے خط مجھے نہ بھیجیں کہ اس کو اتنا واپس بھیجنے میں کافی وقت لگے گا۔ بندہ صرف اس خط کی ترسیل کی خبر کا منتظر ہے اور بس اچھی تو ہا ہوتا تاکہ چند سطریں لپٹی پریشان حالی سے منتقل۔ (قیاسی؛ یہی تحریر کہ وہاں) لیکن چوں کہ ساتھ خط میں اس ضمن میں تصورِ بہت پچھلے ہی لکھ چکا ہوں اور اس خط کا دوسرے خطوط کے برعکس جواب ہی نہیں ملے گا (پھر ایسا ہو گا کہ) اس کا

جواب مل گیا، (یعنی انکار ہو گیا)، ہر صورت مقصد ایک ہی ہے۔ چنانچہ اس خط میں اس کو نظر انداز کرتا ہوں لیکن اس عبودیت نامے کے ساتھ ہی ایک خط میرزا اسیر بیگ خان کے نام، جو نواب ذوالفقار بہادر کے (خدا ان کے اقبال کو قائم رکھے) حاکم ہیں، کھلے لٹاٹے میں بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس کو اچھی طرح جانچ کر اور خوب پڑھ کر مکتوب الیہ کو پہنچا دیں گے۔ عرضِ نیاز کے علاوہ کچھ کہنے کو نہیں!

محمد اسد اللہ

...

۸  
—  
۲۱

قبضہ کا پا!

ذی قعد کی انجیسوی تاریخ، مجھے کے دل، ایک ہمدردی چٹھا تھا کہ آپ کے پرورش نامے کے درود نے میرے سر کو ہال ہما کے سامنے میں۔ (قیاسی: پہنچا دیا۔) سب سے پہلے تو میں نے اس عنایت کا شکر یہ ادا کیا اور اس کے بعد آپ کے کثرت و کلمات پر ایمان لے آیا۔ کہ بہت سے واقعات جمع ہو گئے ہیں اور دل تنہائی کی وحشت اور بے کسی کے دکھ سے بے خبر استبداد میں خون ہو گیا ہے۔ اور مکروہ و مرعوب، جو کچھ بھی ہے، اپنے مرنے کے ضمیر کے سامنے بیان کر دینا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنی عرض داشت کے جواب کی مایوسی سے پریشان۔ (قیاسی: شاہ کہ اتنے میں آپ کا) بظارت نامہ پہنچ گیا اور اس سے میرے دل کی گرمییں کھل گئیں۔ ایسی ایسی اس کو کھولا اور پڑھنے کے بعد۔ اس سعادت نامے کا مطلع اس عرض داشت کا مطلع ہی گیا۔ چوں کہ کتنا بہت کچھ تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس۔ (قیاسی: کم وقت میں، یا کافز کی گفت کے باعث جگہ کی تنگی میں) سما سکے گا یا نہیں، لہذا رسمی تلفات اور القاب و آداب کی عہدت سے صرف نظر کر کے۔ ہد سیدہ اور ناہ سیدہ

(سارے) امور کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔ سب سے پہلے جناب بیگم صاحبہ اور قبیلہ مولوی حسن صاحب کا احوال لکھتا ہوں۔ رمضان کی بیسویں تاریخ، دوسرے کے وقت، میں ایک دوست کی راہ نمائی میں وہاں گیا۔ فائدہ خوانی کے بعد۔ اس عمارت کے قیسی میں بیٹھ گیا۔ اس دیوالت کے چند وابستگان میرے پاس آ بیٹھے اور انہوں نے پرسش احوال کی۔ میں نے لاکھ بکھا کہ میں ایک اجنبی ہوں اور اس سفر میں جناب مولوی محمد علی خان صاحب سے میرا اپنا نیا تعارف ہوا ہے، وہ نہ مانے اور مجھے آپ کے اقربا اور ارکانِ خاندان میں سے سمجھ کر مجھ پر طاقت و دشمنی کا ٹھکان کرنے لگے۔ یہاں تک کہ بیگم صاحبہ کے بھتیجے مولوی غلام علی صاحب اندر سے حشریت لے آئے۔ (قیاس: ان سے مختلف موضوعات پر) گفت گو ہوئی۔ ان باتوں میں کتابوں اور ان کے ارسال کرنے کی دشواری بھی زیرِ بحث آئی۔ کہنے لگے، ہم ہاتھ دینا کہ کتابیں بھیجیں لیکن لے جانے والا بخا نہیں ہے۔ میں نے اس کے جواب میں جو کچھ عرض کیا وہ چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اس جملے کا، جو اس خط میں گلکِ مشکیں رقم سے نازل ہوا ہے، ترجمہ تھا۔ بھلا مجھے (ان کتابوں کے لے جانے میں) کیا تکلیف ہوگی (ابشر) اگر آپ کتابوں کے حاصل کرنے کا طریقہ کھودیں تو میں (کتابیں) لے کر اپنے پاس رکھ لوں گا اور واپسی کے وقت (ان کی) خدمت میں پہنچا دوں گا۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ اس طرح بغیر تعارف پہ کتابیں قبول کرنے والے نہیں۔ مولوی ولایت حسن صاحب اوائلی شعبان میں دوسرے سے حشریت لائے ہیں اور تا دمِ ثمرِ مکتوبِ زیرِ نظر اسی جگہ مقیم ہیں۔ انشاء اللہ آپ کا والائے بیگم صاحبہ کی خدمت میں پہنچا کر مطالبِ مکتوب و پارہ زبانی بھی گوش گزار کر دوں گا۔ (اس وقت) نواب علی اکبر خان والا صفاتِ جنگی میں حشریت رکھتے ہیں۔ ہدوی نہیں ہار چکی گیا اور ان کی صحبت سے لطفتِ اندوز ہوا۔ ایک بار یہ گفتے بھی حشریت لائے تھے اور میرے غریب خانے پر ہم رنجہ فرمایا تھا۔ کالڑہوں جو میں نے لطافتِ طبع، نزاکتِ ادب، حسنیہ بیان، فہمِ درست اور مشربِ صافی والا کوئی ایسا بزرگ صبرِ دینی

\* "معلوم ہوتا ہے، اس وقت کے عمارے کے مطابق "قیسی" عمارت کے کسی خاص حصے کو کہتے تھے، گہرا بیرونی برآمدہ۔



سے گلختہ تک کبھی دیکھا ہوا خواب صاحب ملے ہی ہیں اور مصطلح بھی۔ لیکن ان میں مولوی محمد علی خان والی بات نہیں کہ مجھ سے عاجز کے کام آئیں۔ خدا ان (محمد علی خان) کا حافظہ ناصر ہو کہ عجیب مرنہاں مرنج شخص ہے۔ خدا کی رحمت کے حیرت انگیز آثار میں سے ایک یہ ہے کہ میں گلختہ کی آب و ہوا کا احسان مند ہوں جو مجھے خوب راس آگنی ہے۔ شدید گرمیوں میں نکلے اور مصری کے ساتھ ندریل کے تازہ پانی نے بڑا فائدہ پہنچایا۔ اب، کہ برسات شروع ہو گئی ہے، اس کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ قصہ یہ کہ مجھے جسمانی امراض کی کوئی شکایت نہیں، بلکہ میں یہاں دلی سے زیادہ آرام سے ہوں۔ میرے دوستوں، یاروں اور ہم صحبتوں میں سے افضل بیگ نامی ایک دوست اکبر شاہ جانی کی طرف سے بعنوان وکالت اس شہر میں آیا تھا اور اس کی ختی عبدالکریم کے ساتھ برٹشی پادی دوستی ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ ختی عبدالکریم ہی کے مکان پر مقیم بھی ہے۔ چوں کہ افضل بیگ خوابہ حاجی کا سالہا ہے اور خوابہ حاجی وہ شخص ہے، جس کو احمد بخش خان نے۔ میرا بھائی ظاہر کر کے (پیش میں) ہر ایک بنا دیا ہے، بلکہ میری نالاش کا وہ سرا حدی ہی اس پیش میں اس شخص کی حرکت ہے۔ افضل بیگ۔ (ناکمل) میرے ساتھ پوشیدہ دشمنی رکھتا تھا اور اہل سنت میں مجھے کٹر رافضی اور اہل تشیع میں صوفی و لمحہ و زندیق۔ (قیاسی، مشہور کرتا تھا) لیکن خدا کی قسم اس نے میرے کام میں جو بھی رخنہ ڈالا، وہ میرے لیے روزگار نہات بن گیا۔ کیا کہوں کہ فریڈ صاحب سے ملاقات کے وقت اس کے بارے میں۔ مولوی عبدالکریم صاحب سے کبھی کبھی خط بنائیاں جو نہیں، لیکن علی ایہی اپنی طالب کے اہماز پر نازاں ہوں کہ میرے ساتھ ملاقات میں۔ (وہ) مجھے رخصت کرنے کے لیے آئے اور بٹل گیری اور عطرویان (کی پیش کش)، جو رسم ملاقات کے انتہائی معمولی اور عمومی آداب ہیں، بھالائے۔ چوں کہ فریڈ صاحب کی ملاقات سے میں خوشی اور ہر امید واپس آیا اور میری درخواست اس عدالت کے صاحب کے مطابق بائن صاحب نامی ایک صاحب کو سپرد کر دی گئی کہ ان کا منصب ہی یہ ہے کہ۔ (قیاسی، ان کی خدمت میں پیش کی گئی درخواستوں کا) وہ خواست گزاروں کے لیے فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں اور فریڈ صاحب کو پیش کر دیتے ہیں اور پھر فریڈ صاحب (ان کا) اصل سے مقابلہ کر کے

کو نسل کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ پیر کو جب میں فریڈ صاحب سے ملنے گیا تو صاحب موصوف نے اوائے احترامات و ہر ش احوال کے بعد، بغیر میرے اس بارے میں کچھ کہے، انگریزی میں لکھی ہوئی ایک تحریر مجھے دکھائی اور کہا کہ یہ آپ کی عرضی ہے۔ ہم اس کے مقابلے سے فارغ ہو گئے ہیں، اب یہ صاحبان کو نسل کے پاس پہنچ جانے کی خاطر۔ (قیاسی: جمع رکھیے) کہ آپ کا حق سرکار پر ثابت ہو چکا ہے اور اراکین سرکار (کسی کے) حق کی لڑائی میں کوئی لحاظ نہیں کرتے۔ واضح رہے کہ ان درخواستوں کی پیشی کے لیے ہفتے میں دو دن مقرر ہیں، جمعرات اور جمعہ۔ آج جمعہ ہے، شاید میری درخواست آج کو نسل میں پیش ہوتی ہو۔ اس پیر کے روز ملاقات پر معلوم ہو جائے گا۔ لارڈز یو اسٹرنگ صاحب ایک افسر ہیں کہ کو نسل کی قومی عروسی کے لیے نقطہ بدست میں اور اس کی قومی نزولی کے لیے آخری نقطہ۔ میں نے سنا ہے کہ وہ صاحبِ علم و آگہی ہیں، سنی سنج میں اور... (قیاسی: شر کی) ملاقات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں نے ان کی مدح میں چھٹی اشعار پر شتسل ایک قصیدہ لکھا ہے اور اس قصیدے کے آخر میں کچھ لڑنا مال بھی لکھا ہے۔ مجھے بغیر کسی کی کوشش کے، صحت اتفاق سے، ان کی خدمت میں پسندیدہ و باعزت طریقے سے حاضری کا موقع مل گیا (انہوں نے) میری بڑی عزت افزائی فرمائی اور... (قیاسی: مجھے میری کام یابی کا یقین دلایا) میں نے قصیدہ ان کی خدمت میں پیش کیا اور اس میں سے کچھ حصہ پڑھ کر (بھی) سنا یا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے میری دل جوئی کی اور میرے مقدمے کے کاغذات کو... گو کامیرے یقین کے مطابق وہ میرے حامی و مددگار ہیں۔ ابھی ان سے دوسری ملاقات نہیں ہو پائی۔ کل پیر ہے اگر وہ حضوری کی اجازت دیتے ہیں، فہما اور نہ عید کی قریب میں تو ملاقات ضرور ہوگی۔ آپ پر یہ امر بھی واضح کر دوں کہ یہ شخص (وہ ہے) کہ سارے ارکان... (قیاسی: کو نسل، جمہوریت فریڈ صاحب) اس کے پیش کار اور ماتحت ہیں۔ جب دو یقین مقدمے کو نسل کے لیے جمع ہو جاتے ہیں اور فریڈ صاحب دادخواہوں کے نام اور کام کو نسل کو پیش کر دیتے ہیں اور وہ (اسٹرنگ صاحب) ان مدعیان سے اندازے اور مدار کے مطابق ملاقات کرتے ہیں... اور ہر عرض داشت پر حور کر کے ان میں قابلِ سماعت و ناقابلِ سماعت کو

مصدقہ، مصدقہ کرتے ہیں اور ہر درخواست گزار کے دعوے کو حقائق میں۔ پرکھتے ہیں۔ ہر طور اس وقت تک تو اس ہادی کے مقدمے میں کام یابی ہی کام یابی اور امید ہی امید نظر آ رہی ہے (البشر) افضل مذکور کی مہربانیوں سے ایک دوسری شکل۔ آپ بیتی تھی، (لیکن) وہ بھی خدا کی مہربانی سے انسانی آسانی سے رفع ہو گئی، یعنی وہ جو اس نے مجھے اہل سنت میں راضی اور اہل تشیع میں صوفی۔ مشہور کر رکھا تھا۔ اسی طرح شعرا میں یہ مشہور کر دیا کہ یہ شخص، جس کا نام امجد اللہ ہے اور جو غالب قلعہ کرتا ہے، قتیل کو برا بھلا کہتا ہے اور سخی و رانی گلکش کو بے حیثیت گردانتا ہے اور اس طرح اس نے ان سب کو میرے حکمت کر دیا اور ایک برہمی حقیقت کو میرا مقابل بنا دیا۔ مولوی عبد الکریم کے عزیزوں میں سے ایک نے تو خاص طور پر مجھے ذیل و خود کرنے کی خاطر ایک مصلیٰ ترتیب دی اور مشاعرے کا اہتمام کر کے شعراے گلکش کو دعوت نامے ارسال کیے اور مجھے بھی مدعو کر لیا۔ رشتہ گویوں کو دیکھنے کا اور فارسی گویوں کو فارسی مصرع طرح بھیجا، جب کہ مجھے دونوں مصرع دیے۔ چنانچہ گزشتہ اقوام، ماہ جون کی آٹھ تاریخ کو مشاعرہ ہوا۔ میں بھی گیا اور میں نے دونوں زبانوں کی طری غزلیں پڑھیں۔ اللہ کے کرم سے ہر خاص و عام کو پسند آئیں اور منصف مزاجوں میں سے ایک گروہ نے قریب تک کہہ دیا کہ اس شخص کے سامنے، جس کے کلام میں اس قدر فصاحت ہے، قتیل کیا حیثیت رکھتا ہے، بلکہ اگر اس پر بیدل جیسے دوسرے پیش روؤں کو بھی اس کا ثیل شہر انہیں تویذ دیتا ہے۔ میں خدا کا شکر لیا کرتا ہوں کہ اس نے وہ ہنگامہ، جو میری قویوں و تعذیل کی خاطر کھڑا کیا گیا تھا، میری شہرت اور اہمیت کا باعث بنا دیا۔ آپ اپنی خاطر خاطر جمع رکھیں کہ میں گلکش کی آب و ہوا سے بھی خوش ہوں اور مقدمے کی شروعات کے طریق سے بھی کافی توقعات رکھتا ہوں۔ (انشاء اللہ) آپ کو ہزاروں خوشیاں نصیب ہوں گی۔ اگرچہ میں کم زور ہوں، تاہم میرا خدا قوی ہے۔ خدا کی قسم، اگر آغاز مقدمہ بشارت دینے والا اور خیر پدائنام پذیر ہونے والا نہ ہوتا تو آج میری جگہ یا حیدر آباد میں ہوتی یا اردان کے کسی شہر میں، کیوں کہ پھر میں گلکش میں پانی بھی نہ پیتا اور اپنا ساز و سامان فروخت کر کے ہندوؤں کی طرح آوارگی کی راہ لیتا۔ مجھے امید کی طاقت نے اداوت کا حوصلہ بخشا ہے،

لیکن چند باتیں مجھے اپنے قیام کے بارے میں آپ سے کرنی ہیں اور ان کی تفصیل دوسرے صفحے پر ہے۔

آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ میں خیر کس بے سرو سامانی کی حالت میں مگر میں جلاؤ پیر کر وطنی اور اہل وطن سے رخصت ہو کر جب باقاعدہ اپنا قوم میں نے نواب صاحب سے دو ہزار روپے قرض مانگے۔ (قیاسی: جوا اصول لے) دے دیے۔ میں نے دل میں سوچا کہ غالب، یہ بھی قنیت ہے، لے اور چل! اگر تیرے مقدمے کی سماعت گلشن میں نہیں ہوگی۔ اٹھ پیروں پلٹ کر ہمارے گھنڈی پس کر، عالم گوی شروع کر دینا۔ ہر طور... ہو کر تصویر ہی بہت جڑ بول خریدی اور دشت و صحرا پار کرتا گلشن پہنچ گیا۔ جس دن پہنچا ہوں۔ (قیاسی: میرے پاس) پھر سو روپے (ہائی) تھے شعبان، رمضان، شوال اور ذی قعد تو گزر گئے۔ ذی الحجہ ہی آ گیا اگر آسمان سے کوئی بارے ہلکا ہنی نہیں ٹوٹتی تو (فی الحال) دو ماہ کے لیے میں روٹی کی فکر سے آزاد ہوں۔ نواب صاحب سے دست گیری کی ایک سوہوم ہی امید تھی۔ (قیاسی: لیکن) آج۔ (قیاسی: امید افزا نہیں ہیں) جوں کہ جب کبھی میں نے ایک خط آپ کو ارسال کیا تو پہلے ایک خط نواب صاحب اور ایک خط دوسرے دوستوں اور عزیزوں کو۔ (قیاسی: بھیجا ہے)۔ اگر آپ کی خدمت میں پہنچے خط پہنچے ہیں تو ان کے پاس بھی پہنچ ہی خط پہنچے ہیں، لیکن کوئی آواز نہیں آتی اور کسی نے کوئی جواب۔ (قیاسی: نہیں دیا) یہاں تک کہ میرے کرم علی نے ساری گرم جوشی اور کوپک۔ ایک جواب ہی نہ بھیجا۔ ہی میں آتی تھی کہ نواب صاحب سے (پھر) مدد مانگوں اور ایک ہزار روپیہ مزید قرض لے لوں، لیکن حفظان پیدا ہو گیا اور یہ توقع بھی خواب و خیال ہو گئی۔ امید کرتا ہوں کہ آپ رحمت کر کے اور اس سلسلے میں تصویر ہی کی کوشش کر کے میرے کرم علی کو اپنے پاس خلوت میں بٹا کر اس سے دل کی بات اور اندر کے احوال اور ساری کھری کھوٹی معلوم کر لیں گے تاکہ پتا تو پہلے کہ نواب صاحب اور۔ (قیاسی: نواب صاحب کے اہل) کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔ میں نے نواب صاحب اور ان کے عزیزین سے بھی اس مقدمے کو چھپا کر نہیں رکھا، بلکہ ہر مکتوب اور ہر حرفے میں لکھا ہے کہ۔ (پرجم نواب عالی جناب، پہاڑ کے مقابل ایک شکار آگیا ہے۔ میری مدد سے آپ دست بردار

نہیں ہوں گے کہ (آپ کی) پشت پناہی۔ دشمنی کو مٹا دینے والی (قیاسی) اعانت و دست گیری کے نور پر) احمد بخش خانی اور ان کے بھی خواہوں کی بنیاد سے میں صدائے آفریں بلند کرا دوں گا، (لیکن انہوں نے) کوئی انتہات نہ کیا اور "ہاں" یا "ناں" کچھ بھی نہیں کہا۔ یہاں پر۔۔۔ (قیاسی: یہ غریب الدیاد مایوس) اور بے بس۔۔۔ (قیاسی: ہو گیا)۔ اچھا خاصا دوستوں کی دوستی سے نکلا تو دشمنوں کی دشمنی میں پھنس گیا۔ فرض یہ (کہ)۔ نواب کی سرکار کا حال میر کرم علی کے ذریعے یا جس سے بھی (مظلوم) کر سکیں اور جو کچھ (مظلوم کرنا) چاہیں، حاصل کر کے اطلع دیں اور ان خطوط میں سے (کسی) ایک خط کے جواب کو بھی طیرا ہم نہ سمجھیں کہ دو ماہ کی مدت کچھ بھی نہیں ہے۔ بھور آ اس جگہ سے اپنے ویرانے کو۔۔۔ اس ولوی میں لے جاؤں گا۔ جناب کے گرامی ناسے کا انتظار ہے اور بس! ہر چند کہ دو ماہ میں دن رات بہت ہیں (اور) اہل توکل تو اگر ٹھل ہونے میں صرف ایک رات باقی ہو تب بھی نہیں ڈرتے، لیکن بشریت کا حتماً یہی جہاں ہوتا ہے کہ انسان کو کبھی ماضی کے تصور میں ڈال دیتا ہے اور کبھی مستقبل کے بیوے اس کے ضمیر پر ثبت کر دیتا ہے، ورنہ حق تو یہ ہے کہ حال کے علاوہ ماضی و مستقبل کوئی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ حال ہی ایک نقطہ سوہم ہے، جسے گودش فلک کی بنا پر لوگوں نے فرض کر لیا ہے اور اسی طرح گودش فلک بھی عالم وہم و خیال کی ایک کیفیت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اس کا کوئی وجود نہیں۔۔۔ اور کوئی موثر فی الواقعہ نہیں، خدا کے سوا!

\*\*\*

$$\frac{9}{13}$$

حضرت قبلہ گاہی، ولی نعمی، مدظلہ العالی!  
مجھ میں اتنی توانائی کہاں کہ (اپنے) ولی نعمت کا ٹکڑہ یہ ادا کر سکوں اور اتنی ہمت کہاں

کہ (یعنی) بد جنتی کا گھروہ کر سکوں۔ کھڑا اس کا کہ مجھے بے کس اور شکایت اس کی کہ مجھے ناکس پیدا کیا گیا ہے۔ کیا کہوں کہ میں کیسے دانت پھینا تھا اور کیسا خونریز جگر پھینا تھا۔ کبھی تو میں آکاسے ولی نعمت کے فصیح کلمات پر کڑھتا تھا اور کبھی یعنی کم جنتی کے سبب جتنے گھروہ تھامل ہوتا، کبھی آپ کے نعمت نامے کے نہ آنے پر آپ پر فراموشی کا گھمان کرتا اور کبھی جناب عالی کی ناسازی منطیع کے وہم سے اپنے لیے قیامت برپا کرتا۔ تا آن کہ نسیم مرثوہ ریزہ چلی، اور میری خزاں ہمارا آگئیں ہو گئی۔ ربیع الاول کی انیسویں تاریخ، جمعرات کے روز، دن چڑھے ربیع الدراجات جناب مولوی ولایت حسن صاحب کا آدھی پہنچا اور آپ کا ایک کتوب اور جناب مولوی ولایت حسن صاحب کا ایک خط مجھے پہنچا۔ سب سے پہلے میں نے آپ کا خط کھولا اور اس کی سیاہی کو یعنی قسمت کی آنکھ کا سرمہ بنایا۔ واقعات سے آگاہی اور نامعلوم امور سے واقفیت ہوئی۔ چوں کہ آپ کی اور دوسرے امرواقربا کی سلامتی اور خیریت معلوم ہوئی۔ خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ کھڑا کیا۔ لیکن جاری احوال معلوم کر کے یہ دل خیر طلب دہرے افسردہ ہو گیا۔ اب جو مولوی صاحب ممدوح کی قمر پر نظر پڑی تو لکھا تھا کہ جناب قبیلہ کے حکم کے مطابق دو سوروپے کے عین قلمیہ، جنسیں یہاں نوٹ کھتے ہیں، بچے جارہے ہیں۔ انتہائی صبرت ہوئی اور ایک شدید اضطراب طاری ہو گیا۔ اس وجہ سے نہیں کہ میری طبیعت آپ کی منت پذیر ہی سے گریز کرتی ہے، بلکہ اس سبب سے کہ اگر یہ جناب کے حکم کی تعمیل میں ہوا ہے تو آپ نے اپنے خط میں مجھے اس کی اطلاع کیوں نہیں دی اور دوسری صورت میں تو یہ بات بہت ہی آشکار ہے۔ چوں کہ اس اقتضا کا (بظاہر) کوئی قریب موجود نہ تھا کہ بغیر آپ کے ایما کے یہ امر وقوع پذیر ہوا ہو، سوا اگر یہ آپ کے ایما سے ہوا ہے تو وہ انکانات سے خالی نہیں ہے۔ (ایسا ہی) بظاہر تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے) مولوی ولایت حسن کو میری پرورش پر مامور کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہو سکتا ہے، آپ ہی نے وہ نوٹ یا ہندوئی جناب ممدوح کو بھیجے ہوں۔ لیکن اگر پہلی شق اس طور پر ہے کہ جو کچھ بھی جناب ممدوح سے ملے۔ وہ مجھ پر۔ قرض ہے، خواہ اس کی ادائیگی میں کہوں یا آپ اس سے عہدہ برآ ہوں، اس سے

یعنی اگر مولوی صاحب نے یہ رقم بھیجی ہے تو یہ بات تو واقعی قابل صبرت ہے۔

میری خاک ساری کی کوئی نغی نہیں ہوتی، اور اگر دوسری شق کو یاد کر لیا جائے تو آپ کے ٹھیکے کے کاروبار کی بہتری اور اس میں آپ کے دشمنوں کو نقصان ہونے کا احتمال ذہن کو پرانہ کرتا ہے، لیکن جوں کہ ضرورت مجھ سے قوی تر ہے اور میں بہت زیادہ کم زور ہوں (اس لیے) اس کے قبول کرنے میں۔۔۔ (قیاسی: حار موسس نہیں کرتا۔) اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وقت کی ضروریات، سرکار کے تقاضوں کی پریشانیوں اور اس قسم کے پہلوؤں کی دوسری میں یہ رویہ بھیجنا آسان نہیں تھا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اگرچہ رقم نہ پہنچتی تو میرا حال ناگفتہ بہ ہو جاتا۔ (صورتِ حال یہ ہے کہ) دوست یہاں سے ہو گئے ہیں اور لوگوں کے دلوں سے محبت ختم ہو گئی ہے۔ بھیک مانگنا باعثِ شرم ہے اور بغیر کھانے زندہ رہنا۔ (قیاسی: ناممکن۔) واضح رہے کہ جب تک سبز اور لکڑی کی کش مکش میں تھا، میں نے گھوڑے کو جدا نہیں کیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ ایک عرصے تک۔۔۔ گلشن کی خاک چھانٹا پڑے گی اور اس کے ساتھ ساتھ رہیے اور وقت دو دنوں چاہیں کہ دل اس چھانٹنے کی نگہداشت کے دکھ سے آسودہ ہو، (ناہار) میں نے گھوڑے کو فروخت کر دیا۔ اس کی قیمت بہت بڑھ سوریہ ملی۔ میں نے سائیس کو ہانک دیا اور ملازم کو بھی جواب دے دیا۔ اب میرے پاس تین خدمت گار اور ایک کھاروہ گئے ہیں اور میں بھی، اگر خطی نہیں کر رہا، کم از کم آدھا آدمی تو شمار ہو سکتا ہوں کہ مجھ جیسے بشر دن رات میں کم از کم دو ہار تو منہ سے کے تنور کو گرم کرتے ہیں۔

مرضِ گھوڑے کی فروخت کے بعد پچاس روپے خرچ ہو گئے۔ سو روپے باقی تھے کہ آپ کا مکتوبِ سلامت پہنچا، جس نے دل کا غم دور کر دیا، کیوں کہ میں سوچ رہا تھا کہ جاڑے آ گئے ہیں سو اس کے لیے کوئی خاص اہتمام نہ سہی، ایک گدڑی، ایک توکھ اور ایک کھیل تو بھر بھی چاہیے۔ آپ کی مدد نے مجھے ہڈیوں کر دیا اور بے چینی سے رہائی دلا دی۔ اب گھوڑے کی (فروخت کی) رقم جڑاؤں کے مینا کرنے اور ربیع الثانی کے ہار پختے گزارنے میں خرچ ہو گی اور حالیہ دو سو روپے جمادی الاول کی پہلی تاریخ سے رمضان کی پہلی تک کتابت کریں گے۔ جہاں کہ ہو سکتا ہے کہ ان پانچ مونسوں میں کام ہی جائے اور منہ سے کا فیہ ملے ہو جائے اور منہ سے کے دورانِ جنابِ عالی بھی، جیسا کہ ظاہر ہے، مجھ سے قرض کی واپسی کا

تھا سنا نہ کریں۔ گے۔

خداوند! مجھے مہرے کے کاغذات کو دہلی روانہ کیجے آج یہاں سوالیہ دن ہے، اب تک کوئی جواب نہیں ملا جس کی خبر کھ سکوں۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ خط نہیں پہنچا کہ اس ڈاک میں "خط کبھی تکٹ نہیں ہوتا۔ نہ جانے مکتوب الیر نے کمالی برتا اور جواب نہیں بھیجا۔ چوں کہ وہ میرے ہم دموں اور جگری دوستوں میں سے ہے تو (ہو سکتا ہے) وہ اس انتظار میں ہو کہ مہرے کی لبتا ہو جائے اور اس کا کوئی سراپا نہ میں آئے تو وہ مجھے اطلاع دے۔ امید کرتا ہوں کہ اس خط کا جواب جلد عنایت کریں گے اور حال احوال سے مجھے مطلع کریں گے۔ میرا کرم علی کے لیے بھی ایک خط اسی لحاظ سے در کھ رہا ہوں۔ آپ کے ملازم اتنی رحمت کریں کہ میرا صاحب کو بلا لیں اور اس مکتوب کی تحریر ان کے گوشِ ہوش میں اس طرح ڈالیں کہ ان کی فکر الہامی کو دماغ انداز ہی کی طاقت نہ رہے اور (مزید یہ کہ) ان سے بذور جواب بھی حاصل کر کے اپنے گرامی نامے کے ساتھ مجھے بھیج دیں۔ بھائیوں، عزیزوں اور نور چشموں کو مراتباتِ لائقہ قبول ہوں۔

\*\*\*

۱۰  
—  
۳۳

قسم خدا کی، یہ عبودیت نامہ سے لکھتے وقت ذوقِ حضوری میرے دل میں جوش مارتا ہے (اس لیے) القاب و آداب کی گہا قش نہیں رہتی۔ ہر حال، اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیان بھی سببِ ربط ہو جاتا ہے۔ چوں کہ میری خواہش ہوتی ہے کہ تحریر میں باتِ حقیقت کی کبلیت ہو۔ مجھے نہ مضمون کی تحدید و تاخیر کا خیال ہوتا ہے اور نہ در لسی سخن کی فکر ہوتی ہے۔ میں گفت گو کے تشوب و فراز کو مستانہ طے کرتا ہوں اور اس دلدلی میں بیگشت (چلتا ہوں)۔ اب

اظہار ہے اگر برسی ڈاک کی طرف جس کی شرح خلعت تھی۔



دل میں یہ غش ہے کہ میرا جو حال ہے، وہ آپ پر پوشیدہ نہ رہے۔ اس سے پیش تر ہفتے کے اختتام پر، جمعرات کے روز، صبح کے وقت، جناب مولوی ولایت حسن صاحب تحریک لائے اور مجھ سے افزائِ رخصت لینے لگے۔ (کہتے تھے) میں راسخے میں ہوں۔ دور سے پر جا رہا ہوں اور سفر کا ارادہ ہے۔ جسے جاؤں گا۔ میں نے انہیں دروازے تک پہنچا کر خدا حافظ کہا۔ چلتے چلتے انہوں نے بتایا کہ میری صحت علی حان میرے احباب میں سے ہیں اور میرے ہاشمیں و وکیل ہیں۔ وہ طریقہ ارسالِ مکاتبات سے بھی آگاہ ہوں گے۔ چند روز کے بعد کہ شوق.. آپ کے نوادش نا سے کے ورود نے مجھے بے تاب کر دیا تو میں نے کسی کو صاحبِ مذکور کے پاس ہاندے کے مکتوبات کے متعلق معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ جواب ملے، ہاں، کل ایک خط ہاندے سے آیا تھا، اس کو جسے بھیج دیا گیا ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ غالب کی مسر فرازی کی سلاوت کا خط بھی ضرور اسی لحاظ میں ہوگا۔ مجبوراً مجھے استکار کرنا پڑا اور میں غمگیناں شمار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ آج، منگل کے روز، جمادی الاول کی سترہ تاریخ کو میری صحت علی حان کا آدمی آیا اور اس نے مولوی ولایت حسن صاحب کا خط پہنچایا۔ اس خط کا عنوان ہی معنیٰ رُوبیت کا ایک معنیٰ تھا۔ جب میں نے اسے کھولا تو آپ کے نوادش نا سے کی جھک آئی۔ جب فکر نے حرف و تحریر کا طوبت مکمل کر لیا تو وہی میں مقدمے کے پیش نہ ہونے پر دل میں نئی گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ (چنانچہ یہ لہوئی) ہر شش جماعت سے، فضول الکمار کے ہاؤں داس میں سیٹ کر نفسِ مقدمہ کی بات کرتا ہے۔ کونسل کے چاروں اراکیں کی ڈیوٹی سے جس وقت مجھے دارالحد (وہلی) ہانے کا حکم ملا تو میں نے حاکم کے سامنے فریاد کی اور اپنی ناتوانی و بے سرو سامانی کا کچھ حال بیان کیا۔ واضح رہے کہ ایک صاحبِ راسے و تہذیب افسر ہے جس کو رینڈریو اسٹرنگ کہتے ہیں جو کونسل کی قوسِ عروسی کا باب الا عظم ہے اور قوسِ نزولی کا نقطہ نہایت۔ وہی شخص وہ خواست گزروں کی گزارشات و لوگوں کو اور خدایا پناہ کشور کے فیصلے مظلوموں کو پہنچاتا ہے۔ اس کا مجھ سے ایک تعلق قلبی ہے اور وہ میرے حالِ زار پر نظرِ عدالت رکھتا ہے۔ اس نے جب میری فریاد سنی تو کہا کہ اگر تم نہیں جانتے تو نہ جانتا، فقط مقدمہ بھیج دو۔ مجھے اس امر میں کچھ تاہل ہوا۔ حالانکہ میرا تاہل اپنی

بے کسی کی وجہ سے تھا۔ وہ صنعت سبھا کہ اسے شاید حاکمِ دہلی کی عدم قوتی کا خوف ہے، اور کہنے لگا، ”کیا فکر ہے اور کس سوچ میں پڑ گئے ہو۔ تمہارا مقصد جیوٹا کا بلی سماعت ہے۔ ریزیدنٹ صاحب بہادر سنیں گے اور ضرور سنیں گے، اور کہیں نہیں سنیں گے۔“ دہلی مضطرب کو آرام آگیا اور وحشت زائل ہو گئی۔

میں ٹھہر آگیا اور دہلی کے دوستوں میں ایک ایک کے ساتھ اپنے تعلقات پر طور کرنے لگا۔ ضرورت مند کی مدد کرنے والا کون ہے اور منصب و کالمت کے شایانِ شان کون؟ چوں کہ مذہبی، شوکت و لہارت سے قطع نظر کہ وہ آخر الامر۔۔۔ روساے دہلی میں بلند ترین درجہ رکھتا ہے، ایک گروہ پر گمان ہوا کہ دشمنی کی شان و شوکت سے۔۔۔ ہم وطنی کے مراتب کو نظر میں رکھتے ہوئے اور موروثی اہانت سے دامن کش ہو کر، حرم و حیا کے پردے کو اپنے چہرے سے اٹھا دینا، بالخصوص محمد بیگ بدعت کے لیے، جس میں شکست بھی موجود ہو (دشوار ہو گا)۔ دوسرے لوگوں کے بارے میں یہ وہم دل میں آیا کہ۔۔۔ ہمیں اربا نہ ہو کہ دشمنی سے مل جائیں اور میری تباہی کو حزب کا سرمایہ بنا لیں، کیوں کہ اس عالم کون و فساد میں۔۔۔ (قیاسی) اس طرح اکثر ہوتا ہے۔) ہوتے ہوتے قرعہ غالب مولوی فضل حق کے نام پڑا۔ واضح رہے کہ مولوی فضل حق اپنی مولوی فضلی نام منشی برکت علی خان مرحوم کی اولاد میں سے ہیں۔ آج کل وہ خود دہلی میں صنعت دہلی کی دیوانی اور فوج داری سررشتہ داری۔ (قیاسی) کرتے ہیں۔) خدا انہیں سلامت رکھے اور ان کے مناصب بلند کرے کہ میں نے ان کو صحیح طالب قرار دے کر منتخب کر لیا اور انہیں لکھ دیا کہ اگر۔۔۔ آپ بے گسوں کی پارہ ساری کی ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں تو مجھے بتائیں کہ میں خود کو آپ کے حوالے کر دوں چوں کہ وہ اخوان الصفا میں سے تھے۔۔۔ بنیبر کچھ کہے۔ (قیاسی) انہوں نے میری درخواست قبول کر لی، بلکہ ایک وکیل مقرر کر کے مجھے اطلاق دے دی۔

مختصر یہ کہ میں مہذ سے کے کاغذات، مہذ سے کی بنیاد کو مستحکم کرنے کے لیے، اُس مرضی کے ساتھ، جس پر (اراکین) کو لسل کے دست خط تھے، مع سیکرٹری کو لسل کے خط کے، جو مہذ سے کی اجازت کے باب میں ریزیدنٹ کے شمولی کے اربا پر محیط تھا، اور صاحبِ والا نشان

کی چشمی، بنام کولی بروک صاحب، اور نوب علی اکبر جان صاحب کا خط، بنام منشی  
 التفات حسین خان، یہ سارے کاغذات ایک ورق میں لپیٹ کر خود ڈاک خانے لے گیا اور  
 پوسٹ ماسٹر اور ڈاک خانے کے دوسرے محلے کو اس پر گواہ بنا کر لٹاٹے کو ان کی موجودگی  
 میں لاکھ سے بند کیا۔ اب جو لٹاٹے کا وزن کیا گیا تو وہ دس روپے کے برابر پڑا۔ دہلی کے  
 لیے انگریزی ڈاک کا محصول ایک روپے پر پورا ایک روپیہ ہی ہے (چنانچہ) پورے پورے  
 دس روپے ڈاک کا محصول دسے کر اور رسید لے کر آیا۔ اُس دن سنگھ تھا اور صفحہ کی چودھویں  
 تاریخ تھی۔ ابھی اس مراسلے کے پہنچنے کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ مولوی فضل حق کا  
 خط آگیا۔ مضمون یہ تھا کہ لہنی مہر والا خٹار نامہ بغیر رجسٹری کے نہ بھیجنا حالانکہ وہ  
 خٹار نامہ جو اس کام کے لیے بھیجا جا چکا تھا، غمیر رجسٹری شدہ تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً ایک  
 اسٹامپ خرید کر اس پر خٹار نامہ تحریر کر کے، رجسٹری کرا کر، اُس خط کے چپے روانہ کر دیا۔  
 جس دن یہ کاغذ روانہ کیا گیا انوار کا دن تھا اور درج الفیل کی چوتھی تاریخ۔ آج تک، کہ جمادی الاول  
 کی سترہ یا شمارہ تاریخ ہے، اس خط کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں، نہ ہی اس کا کوئی  
 رد عمل ظاہر ہوا۔ اس وقت تک میں سات خط مزید اس کے چپے روانہ کر چکا ہوں۔ (قیاسی، مگر  
 کوئی جواب) نہیں آیا۔ میرے کمر کی اور غم خوار کا حال تو یہ ہے جو اس تفصیل اور ہندی  
 سے۔ (قیاسی: بیان کیا گیا) گھر کا یہ احوال ہے کہ۔ ایک بھائی ہے جو دیوانہ اور ہوش و  
 حواس سے عاری ہے، جس کا حال اگر میں لہنی زبان سے نہ بھی کمر نکوں پھر بھی مجھ جیسے۔  
 (قیاسی: دوسرے لوگ زبان حال سے اس کی حکایت حسرت آیات سنار ہے ہیں۔) اُس کے  
 علاوہ گھر میں تین پردہ دار پانگشتہ عورتیں بھی ہیں۔ ایک کاشوہر خنیں ہے، دوسری کاشوہر  
 ہے اور وہ سالہ۔ اس مقدمے میں میرا سب سے بڑا اعتراض ہی خواجہ حاجی کی (پیش میں)  
 شمولیت کے خلاف ہے۔ اور ہر طور اس سے مجھے خوف آتا ہے۔ ایسی جنگوں پر یہ کھانا سے  
 حائل ہے اور نہ بزمیان و ہم، لیکن عیسوی کاشوہر سادات دہلی میں سے ایک سید نسب ہے کہ  
 دانش مندی۔ (قیاسی: یہ ہندی) حضیہ یہ کمرہ رکھتا ہے کہ یہ شخص پہلی جنت میں سے ہے۔  
 ہاں نہ آدم منی سے اور سید نور سے (پیدا ہوا) ہے، (اس لیے) آدمیت سیدوں سے بعید

ہے۔ چوں کہ وہ کسی مفید مشورے کے لائق نہیں تو میں نے اسے اس کام پر مامور کیا ہے کہ  
 مقدمے کا کچھ احوال۔ (تجاسی، مجھے) لکھ کر بھیجا کرے اور گاہ بگاہ نہیں، بلکہ اکثر مولوی مسلمان  
 حق صاحب کے پاس جایا کرے۔ میں اس کے چڑا ہر پر قرآن کہ ان تین ماہ میں اس نے  
 صرف ایک خط بھیجا ہے اور اس میں بھی کام کے سلسلے میں کوئی خوش خبری نہیں۔ اسے  
 (سیرے) قبلہ گاہ، کیا کہوں اور کس طرح روؤں! آپ خدا کو حاضر و ناظر جان کر (مجھے) سیری  
 سبے کسی کی دلو تو دیکھیے کہ جب کبھی ان کا خداتہ مقدمہ کے پہنچنے یا نہ پہنچنے پر سیرا جی گھبراہٹا  
 ہے، تو فکر و خیال تسلیع کی طرح ہاتھ سے گر جاتا ہے، یعنی میں دل کو سمجھاتا ہوں کہ انگریزی  
 ڈاک سے خط تلفت نہیں ہوتا۔ اور تم نے چوں کہ اس کو رجسٹری کرا کے بھیجا ہے، اس لیے  
 اطمینان سے رہ، کوئی خطرہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ لفاظی ایسے میں تلفت ہو جاتا اور  
 مکتوب الیہ کو نہ ملتا تو وہ اپنی استثنائی شست قلیوں کے باوجود اس کو عدم رسیدگی کی اطلاع  
 دیتے۔ غرض کہ میں ایسوں کی غفلت کی وجہ سے سبک رہا ہوں کہ خط کے مل جانے اور نتائج  
 نہ ہونے کا بھی یقین نہیں، بجز آئنا و قرآنی کے۔ میں تین ماہ سے اپنے ظم کہے کی دیوار بنا  
 پیشا ہوں، کوئی عزم نہیں کہ اس سے دل کا حال کما جائے۔ میں خود ہی دیوار نہ ہوں، خود ہی  
 ناصح ہوں، خود ہی بیمار ہوں اور خود ہی طبیب۔ میں ہنستے ہیں ایک روز اس آکا سے ولی نعمت  
 کے پاس، جن سے سیرا تعارف صدور و فخر میں ہوا تھا، جایا کرتا تھا۔ اب اس عمل سے شک چکا  
 ہوں کہ اگر جاؤں اور وہ صنعت مقدمے کا احوال پوچھے تو یہ کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ دہلی بھیجا  
 ہی نہیں۔ اور اگر یہ سمجھتا ہوں کہ بھیجا ہے تو لہذا وہ مقدمے کی پیش رفت کے بارے میں سوال  
 کریں گے، پھر میں کیا جواب دوں گا۔ ہر صورت، خدا کا شکر ہے کہ کارفرما ایسا بھی (بڑا)  
 نہیں کہ اس پر غصہ کیا جاسکے اور اندیشہ ہاسے دور دراز کیے جائیں۔ یک گونہ شکایت جو ہے تو  
 وہ اس کے تماثل سے ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس فکر میں ہو گا کہ جیسے ہی مقدمہ شروع ہو تو  
 میں اطلاع دوں اور منشی محمد حسن صاحب کا خط لہذا آج کی تاریخ سے ایک ماہ پیش تر کا ہو گا۔  
 اگر اس خط کی تحریر کے بعد مقدمہ پیش ہوا ہو تو مجب نہیں۔ زیادہ تسلیم!

حضرت قبطہ گاہی، ولیؑ، یہ نظرِ اعلیٰ!

(یہ ہمدوی) مرا تپِ تسلیم کی تسبیح کے بعد، کہ دونوں جہان کی سعادت اس میں ہے، عرض کرتا ہے کہ وہ گوہر۔ (قیاسی: نامہ)، جس پر عنبر کی مہر لگی ہوئی تھی، برادرِ مہمزی حضرت مولوی ولایت حسن صاحب کی وساطت سے، مشکبختِ حال ہوا۔ ہر چند کہ سیری مرض داشت۔ اور دہلی کے حاکم کا اس بارے میں احتیاط اور اسی طرح دار الحکومت کے رہنے والے اراکین کا اس سلسلے میں حکم دینا۔ لیکن جذبہ شوق نے مجھے یہیں سے نہ رہنے دیا اور محنت نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ خداوندِ مہذب کے سلسلے میں خصوصاً... (قیاسی: مجھ سے) برہمی ہرزہ سراہیاں اور گستاخیاں سرزد ہوتی ہیں، تاہم ایساں کی قسم! یہ خیال اس حفظان کی وجہ سے نسا کہ اس کا سودا میرے سر پر۔ آنا کش کے طور پر کم از کم جو ہندوی میں تحریر ہے، نظر آئے، اور چوں کہ میں اس پر یقین کرتا ہوں، مجھے ہندوی کا مالک ہونے میں۔ عقلِ مندی نے مجھے بازو جانے پر مجبور کیا، (چنانچہ) وہاں دو تین جگہ جا کر تحقیق کی تو مکتوب الیہ کا نام اور ارسالِ کردہ رقم واضح اور مستحق ہوئے۔ میں نے (ہندوی) ہمدوی مولوی ولایت حسن صاحب کے سپرد کی اور جیسا کہ میں نے پہلے خط میں عرض کیا ہے کہ رقم اپنی شمی میں لے لی۔ اب بات یہ ہے کہ مجھ کو۔ ہار لاکھ روپے کی رقم کا یوجہ سیری نظر میں ہے۔ کہ میں اس وجدانی کیفیت کا ناظر ہوں کہ (جس نے) سارے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور نسا۔ اس علیے کا ہوتا ہے (ناکمل)۔ خاص طور پر چوں کہ میرا کوئی حقِ خدمت (آپ پر) نہیں بنتا۔ ماقصود ایسے وقت میں کہ (آپ خود) ٹھیکے میں نقصان کے سبب پیچ و تاب میں اور کرہنے کی نگہ پریشانی۔ اور عوام کے تھانوں سے پرانگندہ ناظر ہوں گے۔ خدا کی قسم! میں احسانِ ناشناس نہیں، نہ ہی کم عقل ہوں۔ آپ ہر طرح سے جو سلوک میرے ساتھ کرتے

ہیں، میں جانتا ہوں اور اپنی آوارہ بخشی کا احسان مند ہوں کہ مجھے اس عرصہ سفر میں ایک ایسا منعم و آکا نصیب ہو گیا ہے جس کی مہربانیاں سوائے رحمت ایزدی کے اور کسی سے سراہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اوسے فکر کی شب و تاب سے آزاد ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ باپ اپنے بیٹوں کی پرورش میں ان پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ اس لیے کہ یہ نفسِ رحمانی کا فیض ہے جس کے ہرے میں وہ اپنی ذات سے مراتب کی تکمیل کرتے ہیں۔ چوں کہ بغیرِ ارادہ سلسلہ سنی یہاں تک آپہنچا ہے، یقینی ہوں کہ مدت سے میرے سینے پر ایک بوجھ ہے جسے اب اپنے دہی و لب سے تکلف کرتا ہوں اور اس کے قبل پر بے انتہا مسر ہوں۔ مجھے اپنی حیدرِ حیات میں کسی کو اپنا باپ کہنے پر صرف دو موقعوں پر احساسِ اہتمام ہوا ہے، ایک تو میرا بہر علی خان مغفور اور دوسرے آپ جیسے کرم کرنے والے کو۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں جگہ میں نے الفتِ پدری کو اس کی مکمل شکل میں دیکھا ہے۔ جنابِ مغفور نے بھی کچھ عرصے بعد اپنی قریر کا طرز بدل لیا تھا اور القاب میں مجھے برادرِ مکرّمی میر وارث علی خان کا شریک اور سیم بنا دیا تھا۔ سواب میں آپ سے بھی یہی امید رکھتا ہوں کہ ان القاب سے یاد نہ کیا جاؤں، بلکہ ان القاب سے، جو مولوی ولایت حسن اور دوسرے عزیزوں کے لیے مختص ہیں، سرفراز کیا جاؤں۔ آپ کے خاکِ پا کی قسم کہ یہی کیمیا سے مساوت ہے۔ میں یاد کرتا ہوں (ناکمل)۔ کہ اس کے بعد آئندہ اگر قریر کا طور طریقہ اُس بیج پر ہوا تو میرا دل بے کسی سے چنگل جائے گا اور (میں) بہت... افسردہ ہوں گا۔

خروندی غالب نہ ہو زیں ہمہ گفتن

یکبار ہراسے کہ اسے بیچ کس

[غالب اس لفظی سے خوش نہیں ہوتا۔ بس، ایک بار یہ کہہ کر پکا، کہ اسے ہمارے

بے حیثیت (شخص)۔]

میرے بھائیوں کی بے پروائی۔ فراب صاحب کی محنت اس آوارہ و دروغ پر غفل

گنی ہے۔ خدا کا لاکھ شکر ہے کہ میرے لیے یہی تصویر ہی... محاکا ہے۔

قبلہ لکھا۔ دہلی کا حاکم، جس نے میرے نام خط میں آئندہ الطبعِ ثانی کا احوالہ (ناکمل)۔ کہ میرا مقصد اس کی نظر میں مستحکم معلوم ہوا اور جنرل ایک صاحب کے دورِ ہونانی کے وہ کاغذات، جو ریزیڈنسی کے دفتر میں۔ (قیاسی و موجود) نہ تھے، صدر دفتر سے منگوائے اور صاحبان کو نسل سے اس مقدمے کی نئے سیرے سے تحقیق کی اجازت لی۔ جہاں چہ نواب گورنر جنرل پہلے۔ کہ نسل نے درخواست گزار کی فریاد کے اسباب کی تحقیق و توثیق کا حکم ان الفاظ کے اصرار کے ساتھ، جن کا مطلب "بست جلدی" لگتا ہے۔ (قیاسی و دیا ہے) اور جرنیل صاحب کے عہد کے کاغذات بمجاوے ہیں، اور مجھے یہ ساری باتیں ایک۔ (قیاسی؛ بست عزیز دوست کے ذریعے) معلوم ہوئیں۔ یہاں تک کہ دہلی کے حاکم کے فرمان اور اس حکم نامے کی، جو یہاں سے صادر ہوا، نقلیں بمطابق اصل سیرے ہاتھ آ گئی ہیں، اور منصبِ والدس مسٹر لینڈریو اسٹرلنگ نے جو کچھ بتایا تھا، یقیناً وہی ہوا ہے، بلکہ اس حق پرست بادشاہ کے اندازِ بیاں سے تو یہ ٹپکتا تھا کہ گویا ثانوی رپورٹ کا وقت بھی قریب ہی ہے۔ اس احوال کا خلاصہ جو متواتر۔ (قیاسی و اور مسلسل) ظاہر ہوئی، یہ ہے کہ میرے بھارمحم (نصرت علیگ خان) کی موت کے بعد پس ماندگان کی معاش اور سواروں کی تنخواہ کے لیے بیس ہزار روپیہ سالانہ احمد بخش خان کے ذمے آیا تھا اور یہ وہ رقم ہے جس کی لوا سبکی بطور ایک مستقل ذریعہ معاش کے، یا بطور خراجِ گزاری کے، احمد بخش خان پر لازم تھی۔ خرچے کے (اس میں سے) دس ہزار روپیہ بھاس سواروں کی تنخواہ کی رقم ہے اور دس ہزار مٹھی ضرورتاً کی گزروقات کے لیے۔ میرے ذہن میں جو بیس ہزار سالانہ کی رقم تھی، وہ غلط ثابت ہوئی، اور اگر اس سے کم سمجھتا تو وہ بھی غلط تھا۔ حکام کے انداز و اطوار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سواروں کی تنخواہ کی رقم کی چنداں پروا نہیں کرتے، اور اس کا بھجے کوئی نقصان نہیں پہنچا، کہ وہ رقم میں نے خود اپنی مرضی سے سرکار کو واپس کر دی ہے۔ اس کا

\* قیاسی، معلوم یہ ہوتا ہے کہ دہلی ریزیڈنسی سے غالب کے نام خط آیا ہے جس میں انیس الطبعِ دہلی گئی ہے کہ مقدمہ سماعت کے لیے منظور ہو گیا ہے۔

\*\* قیاسی، میرا خیال ہے کہ یہاں گورنر جنرل ان کو نسل ہو گا۔

مطلب یہ ہوا کہ حکام سرکار سواروں کو مانتے ہیں، چاہے انہیں احمد بخش خان رکھیں اور چاہے نصر اللہ بیگ خان۔ لیکن یہ دس ہزار روپیہ وہ رقم ہے کہ سرکاری قوانین کے مطابق مستقبل ہی میں نہیں، بلکہ ماضی کے بچاؤ ہات کے طوط پر قابل وصول ہے۔ ساری تحقیقات وہ باتوں پر منصر ہوگی ایک تو یہ کہ میں نے اور میرے شہر کا نے احمد بخش خان کی جاگیر سے کیا حاصل کیا۔ اور یہ بات بھی روزروشنی کی طرح واضح ہے کہ نہ میں نے جو لیا ہے، اس سے کم بتایا ہے اور نہ ہی مذاہلیہ اس سے زائد دیکھا سکتا ہے جو اس نے دیا ہے۔ دوسری بات عرابت داری اور شخصی اشتقاق کی ہے کہ احمد بخش خان نے مذاہلیہ کو ہم میں شمار کر کے ہمارا شریک بنا دیا ہے لیکن اس میں بھی کوئی اشکال نہیں چوں کہ میں نے اس کے حفظ مراتب میں کبھی کوئی کھی یا زیادتی روا نہیں رکھی ہے اور ہمیشہ راستی کا شیوہ اپنایا ہے، لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ رینڈینٹ کی رائے کس بات کی مقتضی ہوتی ہے... (قیاسی، اس قدر رقم) خواجہ حاجی اور اس کے لڑکوں کو ملی۔ اگر پردوش کی رقم میں مجرا نہ ہوتی ہوگی تو سات ہزار روپیہ سالانہ۔۔۔ آج تک چاہیے، اور اگر سرکاری کاغذات کے مطابق بھی حساب کیا جائے، جس میں کہ احمد بخش خان کی غلط بیانی کو سراسر دخل ہے، (تب بھی) پانچ ہزار روپیہ سالانہ (ابتداءً ۱۸۰۶ء تا ۱۸۴۱ء مخالفین کے ذمے واجب اللوا۔۔۔ (قیاسی۔ ص ۱۸) میں تو اپنے مقدمے کے جزو ثانی کا مشتاق ہوں، جو غیروں کے اخراج سے عبارت ہے، اور جانتا ہوں کہ چوں کہ میری کوشش کی بنیاد۔۔۔ (ناکمل) اور مذاقہ ترسی نہیں ہے۔ اس جھگڑے میں بھی فتح میری ہی ہوگی۔ جناب قہد کاہی کسی رنگ سے بھی مقدمہ معلوم میں (ناکمل) اس جگہ۔۔۔ کو نسل کے قائلے کی جنبش میں دو عین ماہ کی دیر ہے اور اس قہوی کا یہ حال توانائی اور قدرت الٰہی سے۔۔۔ (قیاسی: یحوناً) فراخ و خوش ولی کا سامان ہم ہو گا۔ آئندہ جو کچھ بیش آئے گا، آپ کی خدمت میں پہنچایا جائے گا۔

مزید خدمت اللہ میں عرض یہ ہے کہ اس قدر حاضر فرمائی کے باوجود میرا کرم علی کے خط کا جواب تحریر نہ کر سکا اور اس کے ساتھ۔۔۔ وہ ظاہر ہوا۔ سکوت کے ساتھ جواب کوئی منفی بات نہیں رکھتا اور خوشی کوئی نقصان نہیں پہنچاتی۔



مولوی ولایت حسنی یہاں نہیں ہیں۔ خط بھلا کیوں آوارہ پھرے اور کہیں سے کہیں پہنچے؟ وہی پتہ شملہ بازار اور گول تالاب اور سیر احمد کی حویلی کافی ہے، کہیں کہ ماضی میں بھی خط کے نہ پہنچنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ خاص طور پر اب، کہ ڈاکے اور کارکنانِ ڈاک جیسے پہچان گئے ہیں، اگر وہ عین دن بعد دم آ پادہلی سے کوئی اطلاع آئی تو اسی روز اس خط کے چمکے ایک اور خط روانہ کر دیا جائے گا۔ خاص طور پر اس خط کے پہنچنے کی خبر میر کرم علی سے پوشیدہ رکھیں، کہیں ایسا نہ ہوا کہ وہ ٹھکر مند ہوں۔ اگر زندہ رہا تو آئندہ ان کے لیے (بھی) ایک خط جناب عالی کے طرزوں کے خط میں رکھ کر بھجوا دیا جائے گا۔ اعتبارِ جز کے علاوہ اور کچھ نہیں! آپ کے فوازش نامے کا جواب اُس کے وارو ہونے ہی کے دن لکھا ہے، اور وہ سترہ یا اٹھارہ جمادی الثانی کی تاریخ ہے، بدھ کا روز اور آدھا دن گزر چکا ہے۔ آپ کا خط پڑھنے اور جواب تحریر کرنے کے درمیان میں نے صرف کھانا کھایا ہے۔

\*\*\*

۱۲

۱۵

۱۰۶

عرب سیرت کے بعد جو کھتا ہے، اس میں سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک زمانہ ہو گیا کہ آپ کے کراچی نامے کا ہما میرے سر پر سایہ انداز نہیں ہوا۔ جب سے میں گلشن میں وارو ہوا ہوں، اس (امر) کا عادی ہو گیا ہوں کہ بیٹھنے میں دو بار آپ کی عنبریں تحریر کی سیاہی سے آنکھیں روشنی کرتا ہوں۔ جب دو ماہ گزر جائیں اور خط نہ ملے تو (بھلا) کس طرح صبر کی باگ پاتہ سے نہ جھوٹے اور استعار کے حال میں نہ تڑپوں۔ خاص طور پر ایسے وقت میں کہ آپ کے مزاج مبارک اور خیریت کی طلبی کی نوید کے بارے میں (دل میں) ظہان ہو، اور پھر میرے ذہن میں تو مستاجر کے گلوں کے مسائل کی پریشانی اور احوال کا پیچ و تاب بھی

تھا۔ امید کرتا ہوں کہ توجہ فرما کر۔ محبت نامے۔ (قیاسی: کے ذریعے) میرے دوسروں کے  
 حصار کو بٹھا دیں گے اور مضطرب دل کو جمعیت کے امن آباد میں پنہاویں گے۔ یہاں کا مال  
 کیا کھٹا جائے۔ دہلی سے خط آگیا ہے اور اس سے یہ اطلاع ملی ہے کہ میرے ارسال کردہ  
 کاغذات وہاں پہنچ گئے ہیں اور میرے کار فرما دوست نے انہیں... لیکن ابھی اس کی وکالت  
 پورے طور پر عمل میں نہیں آئی تھی کیرج صاحب نے رخت سزا باندھ لیا اور دورے کے  
 لیے انہوں نے روانگی کے بازو کھول دیے۔ (بجے اب) لن کی واپسی کا انتظار درپیش ہے۔  
 حاکم کی موجودگی میں کوئی کارروائی کیوں نہیں ہو سکی، اس کا بجے علم نہیں، البتہ جو انتظار تھا  
 سو اب بھی ہے۔ ہر چند کہ میں پانچ ماہ سے سیکرٹری صاحب کے سلام کو نہ گیا تھا لیکن  
 چوں کہ بڑے دن کے روز عید بھی تھی، میں مجبور آگیا۔ (قیاسی: انہوں نے بڑی مہربانی  
 فرمائی) اور نرم لہجے میں شکایت بھی کی اور (مجھ سے) وعدہ لے لیا کہ جتنے خسرے میں ایک بار  
 ضرور طاقات کرتا رہوں گا۔ میں تو خدا سے بھی ہابتا تھا۔ (قیاسی: میں اگر) نہیں گیا تھا تو  
 مقدمے کے احوال سے ناواقفیت کی شرم سے نہیں گیا تھا۔ غرض چند ہائیں انہوں نے  
 مقدمے کی بابت بھی کہیں۔ لن کے انداز اطوار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ۔ زیرِ مائدہ سرکار  
 (اوصورا جملہ)، کہ بھاس سواروں کی تن خواہ کے سلیطے میں ایک ہزار روپے ماہانہ کے حساب  
 سے جو بیس سال میں تین لاکھ روپے کی رقم بن جاتی ہے، بشرطے کہ ہم درودی سے۔ مقدمے  
 کی کاوشوں پر غور کریں۔ چوں کہ عالم اسباب میں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے تو۔ اکی  
 قدرت و طاقت سے جب بھی صبحِ مراد کی روشنی ہوئے گا وقت آیا تو کام پائی کا سورج نیک  
 جنتی کے افق سے چمکنے لگے گا۔ جناب خشی ولایت صنی صاحب کی دورے کے ارادے سے  
 روانگی آپ کی رائے عالم آرا کی مظہر ہوگی۔ نئی نازی یہ کہ ولیم بلی صاحب، کہ کونسل کے  
 سب سے اعلیٰ اور ارفع رکن، میں اور جو ماضی میں گورنر جنرل کے عہدے پر بھی پہنچ گئے تھے،  
 ملک پر ہمارا چلے گئے ہیں اور جناب برینگ صاحب، کہ فی الوقت گورنر جنرل کا اطرا لکھ کی  
 انگوشی کا نشان ہے، گلشنے کے مشرق میں بادے کی شاد گاہ کی جانب یہ ارادہ سیر و شہار چل  
 دیتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ دوپہنے کا لمحہ کر گئے ہیں، جب کہ انہیں گئے ہوئے ایک ہفتہ

ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ مولوی عبدالکریم صاحب، دفتر خانہ قاری کے سیر منشی، آٹھ ماہ کی رخصت پر واپس کے راستے کھٹورتوانہ ہو گئے ہیں۔ (اس وقت تک وہ) تعظیم آباد پہنچ چکے ہوں گے۔

یہاں کی اہم خبروں میں سے یہ ہے کہ اس شہر کے سنی سنیوں اور گنتہ رسوں نے لدوی کے یہاں پہنچنے کے بعد ایک بزم سنی مرثب کی تھی کہ ہر انگریزی میٹے کی پہلی اقوال کو سارے شعر اور سنی فلم حضرات سرکار کمپنی کے مدرسے میں جمع ہوتے اور غزلیں پڑھتے اور سنتے تھے۔ اتفاقاً بادشاہ ہرات کا ایک سفیر بھی، خدا اس کو آفات سے محفوظ رکھے، جو یہاں آیا ہوا ہے، اس محفل میں آپہنچا اور اس نے اس جاسے حالی کے فارسی گویوں کے اشعار سنتے۔ میری اس نے برٹی شہد سے تعریف کی، اور کہا کہ اس کلام کی قدر ہندوستان میں کون کر سکے گا۔ آپ کا کلام تو اس لائق شاہ فضا کے ابران سنتے اور سر دھنتے۔ پھر اس نے ماضی کی طرف رخ کر کے کہا، دوستو، یہ ایک شخص تم لوگوں میں فطرت ہے اور شعر و شاعری سے قطع نظر زبان فارسی کا عالم ہے۔ جوں کہ (انسانی) طبائع جیتنا خود پسند ہوتی ہیں، (انہوں نے) حسد کیا اور اس اچھے کے بزرگوں اور مشہوروں نے میرے دو اشعار پر غلط اعتراضات کر کے انہیں بعض کمیوں کے نام سے شہرت دے دی۔ ان کو اس کے جواب بھی مل گئے اور پھر وہ خاموش ہو کر دھڑ گئے۔ لدوی و غافل علی اکبر خان، خدا ان کے اقبال کو دوام دے، اس منصفی میں میرے ہم زبان رہے ہیں اور انہوں نے ضرر پسندوں کو بڑے مدبر سے خاموش کر دیا۔ جتنا چھ فقیر نے۔ (قیاسی: اس بارے میں ایک شہنوی لکھ کر) اپنے مجوزہ انکسار کے اظہار کے ساتھ ساتھ ان کے اعتراضات کے جواب بھی دیے ہیں۔ پس۔ (قیاسی: قوی امید ہے کہ، (یہ واقعہ) خاطر منیر تک بھی پہنچایا جائے۔ انشاء اللہ اگلی بار جو خط ارسال کروں گا، (یہ احوال) اس میں ملخوف ہو گا۔ ایک خط (اسی لفافے میں) میر کرم علی صاحب کے لیے بھی ارسال کر رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ لدوی کے خواجہ تاش، یعنی آپ کے ملازم۔۔۔ (قیاسی: یہ خط انہیں پہنچا دیں گے)۔ زیادہ سوائے تسلیم کے کیا عرض کروں!

محمد اسد اللہ، معروف چارم رجب

۔ وہ یمن دن گزرے ہوں گے کہ اس راقم کے ہم کدے سے ایک خط آیا تھا، جس میں شاید مقصود کے خطوط کی کچھ نقش بندی کی گئی تھی۔ اٹھا کر وہ ۴ ملیں نے اس پر اس حد الت کا احوال سیرانی تحریر کے لکے میں مزید شامل کر کے بند گاں حضور کی خدمت میں پیش کش... کر دیا، سو نظر سے گزرا ہو گا۔ آج، کہ میر کا دن ہے، رجب کا پہلا ہفتہ اور دن کا آخری پار، میر سے کار فرما دوست کا ایک خط... میں جس کے بارے میں سابقہ خطوط میں لکھتا رہا ہوں، آپہنہ۔ چوں کہ اس مکتوب میں اطلاعات کی استعداد تھی... عرض داشت بھیج دی گئی۔ خداوند! خدا کی قسم، میرا دوست میر سے کام سے ماہل نہیں تھا، اور اس نے ہمارے جوتی سے کبھی پہلو تھی نہیں کی، بلکہ (یوں کہنا چاہیے کہ) وہ مجھ پر مجھ سے زیادہ مہربان ہے اور ہمارے جوتی کے طور طریقوں سے مجھ سے زیادہ واقف۔ یہ جو آج تک اس نے کوئی اطلاع نہیں دی تو یہ یک دلی اور یکا گت کے افتاد کے باعث تھا نہ کہ دوری و دیوانگی کے سبب۔ ان کا یہ خط ان کی گرل ماگچی کا نکاس ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ غالب خستہ کو جوتی کے خبر جان کر ہفتوں اور مہینوں خط سے محروم نہ رکھیں گے۔ دیگر یہ عرض ہے کہ موجودہ خط کو لکھے تین دن سے زائد گزر چکے ہیں اور اس عرصے میں کوئی نئی بات ہوئی نہیں اور جو کچھ لکھنا تھا وہ میں پورے طور پر سابقہ خط میں لکھ چکا ہوں۔ اس کو محض ہرزہ سرائی نہ جانیں اور اس سے زیادہ (کچھ لکھنا) میں نے جواوب نہ جانا۔

محمد اسد اللہ

\*\*\*

\* جملہ نامکمل ہے۔ الگ جملے سے کچھ اس قسم کا اشارہ ملتا ہے گویا اسی خط پر غالب نے کچھ لکھ کر کے مکتوب الیہ کو روانہ کر دیا۔

## ۱۳ — ۱۲

قبلہ کا ہا!

بے شمار دن بیت گئے اور ناسے گزر گئے کہ گراہی ناسے کی سیاہی چشم مشتاق کو سر نہ نہیں پہناتی اور تسلیم حمایت مقام جاں پر خوش خبری کا خطر نہیں پھڑکتی۔ دو عرض داشتیں، جن میں سے ایک قصہ آلود دوسری مفصلہ دہلی کے احوال کے نقوش سے جیب و آستین کو مرضع کیے ہوئے تھی، کس طرح کھول کر۔۔۔ (قیاسی، آپ تک نہیں پہنچیں) اور اگر یہ جان لوں کہ پہنچ گئیں تو پھر یہ کس طرح جان لوں کہ جناب عالی نے (ان کا) جواب نہیں دیا۔ اسی پہچ صاحب میں اور طرح طرح کے وسوسوں میں۔۔۔ (قیاسی، سکون) کھویدشاہوں اور صبر کی کشتی نے خودداری کا لنگر توڑ ڈالا ہے۔ خدا کی قسم، آپ جیسے مہارک نہاؤ، کرامت آنکار شخص کے بددش ناسے کی تاخیر بچے بے چین کر دیتی ہے۔ ورنہ کشمکش تسلیم کو حوصلہ دیتا ہے۔ (سیری) فضول خواہشات کا سراپ۔۔۔ یہ ہاجتا ہے کہ غیر طلب دل کی گمراہی اور مٹو جیسے ضمیر کے وجدان کے حوالے کر کے کچھ حصہ۔۔۔ (ناکمل)

خداوند! اس سے پیش تر ولیم بلی صاحب، جو ارکان کو نسل میں اس قدر تری حاکم ہیں، ملک برہما کی جانب۔ (قیاسی، حشریت لے گئے ہیں اور) جناب لارڈ بینک صاحب گورنر جنرل ہی ان ہی دنوں میں سیرو شہار کے لیے گلشن کی طرف جانب مشرق چلے گئے۔ چنانچہ ایک ہفتہ۔۔۔ (قیاسی، ہڑا) کرو لیم بلی صاحب گلشنے وارد ہو چکے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ لارڈ گورنر جنرل بہادر بھی آج حشریت لے آئیں۔ کل ایک باخبر شخص نے بتایا کہ وہ اہانک پہنچ بھی چکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ بنارس کے رہا لوگوں نے انہی سنگے ایک جمعیت کے ساتھ بڑے

ٹان وشوکت سے اس شہر میں وارد ہوئے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے لوگوں میں یہ بات مشہور کی ہے کہ میں جگناتھ جا رہا ہوں، تاہم حقیقت دراصل یہ ہے کہ اس عرصے میں حاکمانِ صدر نے ان کی عمل داری کے لیے ایک نیا قانون اور سخت متبادل وضع کیا ہے اور راہا صاحب اس پر خوش نہیں ہیں اور راہا کی ناراضگی حق بجانب ہے، کیوں کہ اس قانون کا نتیجہ یہ ہونا ہے کہ اس حکمرانی اور ٹراں روانی کی شوکت و ٹان برہاد ہو جائے (جہاں چہ وہ) داورسی کے لیے آئے ہیں حالانکہ فرمانِ منسوخ نہیں ہو گا اور نہ ہی حالات میں کوئی تبدیلی آئے گی۔

دوسری خبر یہ ہے کہ گورنر جنرل کے پدموں کی روانگی تمام ارکان کو قتل اور محال و فتنے کے ساتھ اگست میں، بجانب ہندوستان ہو گی، اور وکھ، سفا، منعت حضرات اس لشکر کے چپے ہائیں گے۔ اس علاقے کے دادخواہوں کو مرثوہ ہو کہ وہ (مقامی) ریزیدنٹ اور ارمٹ کے قدموں میں پادمال نہیں ہوں گے۔ خاص طور پر وہ لوگ، جن کا سونہ تلوار کی دھار پر مسلسل رگڑا رہا ہے، اور جو برہمن آہو بکا کرتے اس قافلے کے ساتھ ہوں گے۔

طالب بدبخت کی غربت زدگیوں میں سے مزید خبر یہ ہے کہ شنید یہ تھی کہ جنوری کے اواخر میں ریزیدنٹ کی واپسی دہلی ہو گی۔ اب، کہ جنوری ختم ہو کر فروری کا آغاز ہو گیا، لازمی وہ دہلی پہنچ چکے ہوں گے، اور میرا مقدسہ (بھی) پیش ہو گیا ہو گا۔ دیکھا ہاں ہے کہ ان پانچ چھ مہینوں میں کیا ہوتا ہے۔ آخر کار ایسا نظر آتا ہے کہ بمقدار "قصر زمینی بر سر زمین"، اس قسم کے مقدمات میں آخری حکم ایسے ہی مقدمات پر کارگر ہوتا ہے اور کسی جگہ کے مقام کی خط نمائی کی گنجائش نہیں رہتی۔ جہاں چہ جناب سیکرٹری صاحب نے، جن کا ہدی کے ساتھ (اس معاملے میں) پورا اطلاق ہے، بر سیل تعلق یہ کہتے تھے کہ اس طرح (یعنی گورنر جنرل اور اہمیان کو قتل کے دہلی ہانے سے) آپ لوگ ریزیدنٹ کی خوشی ناخوشی سے عاقبت میں ہیں، کیوں کہ لارڈ صاحب بہ نفس نفیس ہر مقدمے کی تہ کو پہنچ کر عظم و ستم کو دھو کر نا انصافیاں دور کر دیں گے۔

اس شہر کی دیگر خبروں میں سے ایک یہ ہے کہ ہدی و مکرمی سولوی ولایت حسن

صاحب دورے سے واپس آ کر یحییٰ ہار ولی آرام کر کے دوبارہ (دورے پر) چلے گئے ہیں۔  
 بدیہا کوئی ایسی ہی ضرورت ہوگی ورنہ اس کا بھلا کیا امکان تھا کہ وہ اپنے درود کی روشنی سے  
 میرے غم کے سوا کوئی اور چیز نہ کرتے اور مجھ بندے کو خیر جنابِ مہر و م کے ہانے کے بعد  
 ملی ورنہ کیا ممکن تھا کہ دوڑ و دوڑ سے ملکات نہ ہوتی۔

ان حالات و واقعات میں وہ بات، جس سے ظاہری سنی حاصل ہوتی ہے اور تحریر کو  
 وقعت دینا آتی ہے، جنابِ نواب سید علی اکبر خان طہاٹانی کے اخلاق کی توصیف ہے۔  
 خدا ان کے سامنے کو دوام بخشنے، اور ان کا اقبال ہمیشہ قائم رہے۔ اس خدا کی قسم، جس نے  
 عقل کو پیدا کیا اور خرد کو استجاب کیا کہ اس لادش مندی اور صاحبِ ولی (کے رتبے پر) بنگال  
 میں کوئی اور نہیں۔ میں جب کبھی اس پسندیدہ آفریدگار کے ظاہر اور باطن پر بصورت...  
 (قیاسی: غور کرتا ہوں تو) حیرت میں ڈوب جاتا ہوں کہ یہ قیمتی موتی کس کان کا ہے اور یہ اعلا  
 لب کس خاندان سے ہے۔ یہ۔۔ (قیاسی: موصوف) ایسی شغف کا اظہار کرتے ہیں، جس کی  
 فہم نہ رہاں سے ممکن نہیں۔ جب بھی بھلی سے حیرت لائے ہیں، کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ  
 اپنے درود سے مجھے۔ (قیاسی: افتخار نہ بخشیں)۔ (قیاسی: جب اس شعر کے چند مرسلے) حمد  
 کی بنا پر مجھ سے الہ پڑھے تھے تو نواب علی اکبر خان ہی نے اس قصبے میں میرا ساتھ دیا اور  
 میری مدد کی۔ اب کہ۔ (قیاسی: ان کی) چھوٹی لڑکی کی شادی درپیش ہے، وہ مجھے یہ طے کر گئے  
 ہیں کہ میں جب بھی بھلی گار، تمہیں بھلی آنا ہو گا اور میرے ساتھ ایک ہفتہ رہو گے۔ میں  
 نواب صاحب کے بلوے کا منتظر ہوں۔ ظاہر ابھی تاریخ مقرر نہیں ہوئی ہے۔ نواب صاحب  
 موصوف نے مجھے دو خط لکھے، اس خط کے ساتھ ہی... (قیاسی: میں ایک خط نواب صاحب کے  
 لیے بھیج رہا ہوں) تاکہ ملازموں کی نظر سے گزرے اور نواب صاحب کی خاکسار نوازیوں کا  
 آہرہ سے۔

قبلہ کہا!

چند عجیب باتیں تصور پذیر ہوتی ہیں۔ (ایسی) کہ اگر ضبطِ تحریر میں نہ لکوں، تو دل اس عثمان سے آرام نہ پائے گا۔ غرض کہ۔۔ اور جو کچھ گزری ہے، پیش کرتا ہوں۔ مشکل کے دن ستائیس رجب کو ایک عرض داشت خدمت میں بھیجی تھی۔ (قیاسی: خط ڈالنے والا ابھی) واپس نہ آیا تھا کہ ٹھکر ڈاک کا ایک ڈاکیا پہنچا اور اس نے جنابِ عالی کے مکتوب کی رپوسیت (بجے) پہنچائی۔ کتبِ خاک۔۔ (ناکمل)۔ اب جو اس مشہور رسالت کے عثمان کو کھولا گیا تو جنابِ عالی ہمدردی۔۔ خدا ان کی مثال کو ہمیشہ برقرار رکھے کی نگاہِ فروزہ نظر آئی۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ جنابِ عالی قسریت لائے تھے اور واپس بھی چلے گئے۔ لہذا نیاز نامہ۔۔ جناب میر صلات علی خان صاحب نے لکھ کر آپ کے گرامی نامے کو اس میں لپیٹ کر ایک ملازم کو دیا کہ انشائی میں میر صاحب موصوف کی خدمت میں۔۔ (قیاسی: پہنچا دے۔) ابھی وہ، خط کا لے جانے والا، واپس بھی نہیں ہوا تھا کہ ہمدردی ملوی جناب مولوی ولایت حسن صاحب کا آدمی آ پہنچا اور اس نے جنابِ عالی کا مشہور سرفرازی جنابِ مدوح کے خط میں لپٹا ہوا۔ مجھے پہنچایا، (جس سے) میرے شوق کے جسم میں جان آ گئی۔ جنابِ عالی کا نوازش نامہ، جو انیسویں جنوری کا لکھا ہوا تھا، وہ خط تھا جو اللہ کا نبی کی کے خط کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ ہمدردی اس نوازش نامے کی اس عبارت پر، کہ۔۔ "تساری عرض داشت پہنچ گئی۔ ایک کا جواب اس سے پہلے بھیج چکا ہوں،" خود صیرت میں پڑ گیا تھا کہ مجھے کون سا جواب ملا ہے۔ آج اس بات کا راز کھلو کہ یہ وہی نامہ سوسود ہے۔ البتہ اب جو مجھے معلوم ہوا کہ جناب مولوی صاحب اپنے دوسرے دورے سے بھی واپس آ چکے ہیں تو میں نے عثمانی ناکائی روزِ نگار گشت کی اور دور ہوا ان کے پاس پہنچا۔ چنانچہ اس وقت، کہ دل ختم ہونے میں دو گھنٹے باقی ہیں، میں مولوی



صاحب موصوف کے گھر پر ان کی مسند حضورؐ کے خوش لکھنوں میں سے ہوں اور ۔  
 عرض داشت بھی ان کے سامنے ہی لکھ کر ان کے سپرد کر دی ہے، تاکہ وہ گل اپنے خط میں لپیٹ کر  
 اسے پتہ بھیج دیں۔ رہا وہ پیغام، جو آپ نے نواب علی اکبر خان دام اقبالہ کے لیے بھیجا  
 ہے، ان سے ملاقات ہونے پر، جو ایک شادی کی تقریب میں شرکت پر جلد ہی متوقع ہے،  
 طہذابی خدمت کے سامنے کی تمویل میں دے دیا جائے گا۔ جز تسلیم اور کیا عرض کروں!

محمد اسد اللہ، معروف سنہ چہارم فروری، بروز بدھ

\*\*\*

۱۶  
 —  
 ۸

حضرت قبلہ گاہی، ولی نعمی، مدظلہ العالی!

(یہ ہمدی) آپ پر قربان ہوتا ہے، اپنی جان اُس کتبہ پاک کی خاک پر نہا اور کرتا ہے  
 اور نہیں سمجھتا کہ کیا عرض کرے اور کون سی قریر کے پردے سے سر نکالے۔ آپ کی  
 یاد آوری کا احسان بے کراں ہے اور آپ کی ہدایاتی کا نگر بہ اندازہ قریر نہیں۔ برسوں  
 جناب مثنی ماشق علی خان صاحب بہادر نے ایک مکتوب مجھے بھیجا، اب جو لفظ کھولا تو اس  
 پردے سے ایک نور چمکا۔ ابھی طرح دیکھا تو خداوند کے مکتوب کے آثار تھے، جو حالی مدوح  
 کو اس مشت طہار کی عاجزی کی آگاہی کے لیے لکھا تھا۔ غرض کہ ان کے حذر میں نے اس  
 ننگ آفرینش کو لکھا کہ کوئی وقت مقرر کر کے مجھے اطلاع دو تاکہ تسار اسر آسمان سے بھی  
 بلند گردوں اور اپنے درود کا نور تسارے غلٹ کدے پر ڈالوں۔ میں نے جواب سے معذرت  
 کر لی اور دوسرے دن خود ان کی خدمت بوسی کے لیے گیا۔ اگرچہ دفتر کے آنے جانے میں  
 جناب مدوح سے تعارف۔۔۔ (قیاس: ہو چکا تھا بلکہ) قبلہ و کعبہ نواب علی اکبر خان کے مکان پر

گئے تھے کا اطلاق بھی ہوا تھا، لیکن اس مرتبہ۔۔ (ان کی) محبت کا نقش دل پر جم گیا۔

جناب ممدوح قدرے اہل وحدت الوجود کے مذاق کے مطابق بات کرتے ہیں اور اس وجہ سے سندسے کی ثنوی اور تحسنتیں ہیں۔ شیعہ و چرخ انجمن مولوی ولایت حسن کے شیوخ اطلاق کا اور میر سپہر و معنی آشنا نواب علی اکبر خان طہا طہائی کے ذوق لطیف کا کچھ ذکر (قیاسی و کیا۔) جناب قبیلہ گاہی کے خدام کا احسان میر سے دل و جان پر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی صحبت سے جو خط میں نے اشیا وہ بمصدقہ بقا پڑا اسی برکت البرکت میری زبان پر تھا۔ اس مرتبہ آبرو میں مزید اضافہ ہوا اور ایک نئی شان پیدا ہو گئی۔ خدا کی قسم، اگر میں اس آوارگی کے پتھر میں آپ کے پاس نہ پہنچتا تو میری خشکی کے لیے مرہم اور کھسکی کے لیے مومیائی کھماں سے ملتی۔ اگر انصاف کی ڈور ہاتھ سے نہ چھوڑوں تو میں جانتا ہوں کہ میر کرم علی کے احسان سے عہدہ برآ ہوتا، کہ انھی نے مجھے اس آستانے کی خاک کا راستہ دکھایا اور میر سے بچے خضر راہ بن گئے، میر سے بس کا نہیں، سو بھلا ان کے حلاصول کی مدح میر سے بچے کہاں ممکن! ہرگز نہیں، ہرگز نہیں!

حاشوشی از شناسے تو جز شناسے گشت

[تیسری تعریف میں حاشوشی ہی تیسری انتہائی تعریف ہے۔]

جو احوال کہ لائق تحریر تھا، (وہ ہیں) اپنے سا بھ خطوط میں۔ (قیاسی: کچھ چکا ہوں) ہر ایک آپ کی نظر سے گزرا ہو گا اور آئینی تسلیم کا آئینہ دار ہوا ہو گا۔ وقت کے اس حصے میں سوائے اس کے کہ چاہئے یا نہ سمجھنے سے۔ (ناکمل) اور کام کے پھر سے سے (ناحال) پردہ نہیں اٹھا ہے۔ میر احمد علی جان کے مکتوب کا جواب، اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ جناب کے مکتوب ہی میں ملفوف تھا، بھیج دیا گیا ہے، سو میر سے خواہہ ناشوں کی عزت سے مکتوب الیہ کو چننا دیا جائے۔ خدام عالی مقام کے ضمیر روشنی سے چلی نہ رہے کہ یہ خط بخشی شعبان، بدھ کے دن لکھ کر اسی روز میر صفات علی جان کی وساطت سے لاد کانہی مل باندوی کو بھجوا دیا گیا۔ خدا سے اس کو اپنے خط کے ساتھ ملفوف کرنے اور بھیجنے کی توفیق عطا کرے۔

حضرت قبلہ گاہی، علیٰ رحمۃ اللہ، مدظلہ العالی!

(یہ ہمدوی) کھدش بجالاتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ اس سے پیش تر (چند) کمٹوات ارسال کیے گئے ہیں۔ جانتا ہوں کہ ان میں سے ہر خط اپنے وقت پر آپ کی نظر سے گزر کر مقصد کی صورت کا حفاص ہوا ہو گا۔ اُس احوال کا حقیقہ، جو کن لور افق سے تعلق رکھتا ہے، یہ ہے کہ چوں کہ مثنیٰ عاشق علی خان صاحب بہادر نے مجھے اپنی تشریف آوری کی خوش خبری دی، میں نے خود حاضری دے کر ان پر مسابقت کی۔ انہوں نے برسی حیات فرمائیں۔ "یہ فیض آپ ہی کی صحبت کا نتیجہ ہے، نکھتا ہوا میں اٹھا اور اپنے ظلمت کدے میں آگیا۔ چند روز بعد احوال کے دن مجھے اطلاع دیے بغیر جناب ممدوح (ایسے وقت) میرے گھر تشریف لے آئے کہ میں موجود نہ تھا، جب میں واپس آیا اور مجھے معلوم ہوا تو میں پانی پانی ہو گیا اور تکلفی ملاقات کے لیے تیر تھری کرتا ہوا ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

غواب علی اکبر خان بہادر ہنگی ہی میں تشریف رکھتے ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے بلائیں گے۔۔۔ (قباسی) لیکن ابھی تک انہوں نے) یاد نہیں فرمایا ہے۔ قبلہ گاہی کی گزارش جناب کی زبان سے واپس ہے۔ غالباً شادی کے کاموں سے فارغ ہو کر۔ مولوی ولایت حسن صاحب دوبارہ دورے پر چلے گئے ہیں۔ ایک موقع ملا تھا۔ دور ان گفت کو فرماتے تھے کہ۔۔۔ اور ہم پر احسان رہ گیا (ناکمل)۔

اس سے پیش تر میں جناب کے خادموں کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں کہ بنارس کے راہا۔۔۔ (قباسی) اور دوت نرائن سنگھ نے) گورنر جنرل بہادر سے ملاقات کی جو اسد ماکہ تھی وہ منظور ہو گئی ہے اور عام حاضری ملے پا گئی ہے۔۔۔ درمیان نہیں رہا (ناکمل)۔ کسی کو خبر نہ ہوئی، یعنی مجھے کے دن، ۱۳ فروری کو جناب سیکرٹری .. (قباسی) انڈریوز) کے، کہ میں ان

کے خدوہوں میں سے ہیں، محلے کے اٹھنے کے وقت نائب میرمنٹی کو کہ میرمنٹی کی  
 طہیر حاضری میں کارروائی کرتا ہے۔ اہل ہار کو صلوے دے کہ پیر کو دربار کا دن ہے، وقت  
 منوختہ پر دربار گاہ پر پہنچ جائیں۔ اس عرصے میں راتوں رات اس احوال سے مطلع کرنے والا  
 ایک خط انھوں نے مجھے بھیجا۔ دوسرے دن جلتہ تھا۔ میں صاحب موصوف کی خدمت میں  
 حاضر ہوا اور صفوری کی فتا کی، جو انھوں نے انتہائے کرم سے منظور کر لی اور کالی سہرائی  
 کی۔ میرا نام صفیہ اسحاق الیمین میں۔ (قیاسی درجہ کراویا) اور مجھے عزت کی کرسی پر بٹایا  
 اور حمیہ الحقائق سے (خلائیوں کی ترتیب اس طرح ہوتی کہ) نمبر ۱ پر رہا جو پ سنگھ جانشین  
 راہا کھپان سنگھ عظیم آبادی، \* نمبر ۲ سفیر شاہ دہلی، نمبر ۳ سفیر شاہ اودھ، نمبر ۴ ہمایوں شاہ  
 نواب مرشد آباد کا وکیل، نمبر ۵ وکیل جودھ پور، نمبر ۶ وکیل بے پور، نمبر ۷ وکیل  
 راہا نپال، نمبر ۸ میرے قلمدہ کعبہ جناب اکبر علی خان بہادر دام اقبال، اردوواں نمبر ۹ دی  
 کا قرار پایا۔ اس سمرت کی تفصیل کہ مجھے ایک انجمن میں ایک ایسے شخص کے پہلو میں جگہ  
 دی گئی ہے، جسے میں شرفا سے بلالہ میں منتخب۔ (قیاسی شمار کرتا ہوں)، ضبطیہ تحریر میں ہوا  
 کہاں آسکتی ہے۔ لیکن افوس، کہ نواب صاحب بگلی سے تحریعت نہ لائے اور انھوں نے  
 معذرت ارسال کر دی، مختصر اور مفید۔ جب میں نے صاحب نعمت کی عنایات اپنے لوہ  
 پیش از پیش دیکھیں، (تو میں نے) خلعت کی آرنڈ کی۔ وہ تصویر کے لیے سوچ میں پڑ  
 گئے، پھر سر اشایا اور بڑے دل فریب انداز میں کہا، اسے غلے لے اس وقت اس کی گنجائش نہ  
 تھی کہ کسی کا نام اہل دربار میں اعلان کیا جاتا۔ ہم نے (حیرانام اعلان کر کے) تیری دل وہی  
 اور خاطر داری کی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ خلعت نہیں دلا سکتا، تاہم اس وقت خلعت کی  
 گراں مانگی برلوشٹ نہیں جا سکتی۔ تو خود دیکھ کہ تیرا لچھا سرکار کے مستوفیوں اور سرورلوں میں  
 سے تھا اور اسے اس منصب پر کبھی خلعت نہیں ملی۔ لہذا تیرا گہر کو بھی دس ماہ جو چکے  
 ہیں۔ ایسے وقت میں کوئل کو تیرے احوال سے تفصیل سے آگاہ کرنا اور تیرے بزرگوں

\* کاتب نے "نمبر ۲" نہیں لکھا، لیکن قرانی سے معلوم ہوتا ہے کہ نمبر ۲ راہا  
 جو پ سنگھ کے باپ بانک سنگھ کا تھا۔

کے نام کے خایانِ شانِ تیرے لیے صفت حاصل کرنا ممکن نہیں۔ وہ آں حالے کہ تو نے صفت پر ایک عجیب امر کا اہمال کیا ہے۔" صبر کر اور آرام سے بیٹھا جب (گلشنے سے تیری) رخصت کا وقت آنے لگا، اس وقت ایک صفتِ گراں پایہ "بہادر" کے خطاب کے ضمیمے کے ساتھ تیرے لیے لارڈ صاحب کے آستانے سے حاصل کر لی جائے گی۔ چوں کہ یہ باتیں اس قدر خوش کن تھیں، میں خاموش ہو گیا۔

غرض کہ پیر کے دن بارگاہ پر پہنچا۔ چوں کہ نمبر نو، کہ علی اکبر خان کا ہے، خالی تھا۔ اسی طرح چھوڑ کر میں دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب نواب گورنر جنرل بہادر پھر صفت لائے اور اہل۔۔۔ (ناکمل)۔ (قیاسی: میرے پیش ہونے کی باری آئی، میں نے دو اشرفیاں نظر کیں۔ رسم کے مطابق انھوں نے معاف فرما کر چند سے توقف فرمایا اور میری نیاز مندی کو۔۔۔ سراپا اور انتہائے شفقت سے اپنے دستِ خاص سے حلقہ پان مجھے عطا فرمائے۔ لیکن اب ایک دوسرا امر، مجھ سے بہ ظاہر (قیاسی: سفیر) و بی، سفیر شاہ اودھ اور وکیلِ نواب مرشد آباد نے جب اپنے منہ کھن کے شوق کا اظہار کیا، ہم۔۔۔ (ناکمل) اور ایک دوسرے کو دیکھیں۔

اس سے پہلے یہ بات زبانِ زوہام تھی کہ باہر آگست میں نواب گورنر جنرل مع کو نسل، اور تمام اہلِ وطن کو نسل ہندوستان ہائیں گے، اب اس کی تصدیق ہو گئی کہ ان کی روانگی طے ہے۔ (قیاسی: البتہ یہ نہیں معلوم) کہ کو نسل بھی ان کے ساتھ ہی جائے گی یا نہیں رہے گی۔ پہلی صورت میں مجھے بھی الحاح و خیرِ ازل سر کے بل جانا چاہیے۔ اور۔۔۔ (ناکمل)۔ مجھے بہ ہر حال یہیں رہنا ہو گا۔ گھر والوں کے خط سے منسلک مولوی فضلِ حق صاحب کا ایک رقم بھی پہنچا ہے۔ (قیاسی: اس کو بھی اپنے خط کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں، کاشفِ احوال ہو گا۔ زیادہ مددِ نواب!

معروضہ ۱۴ فروری، مطابق ۲۲ شعبان، بروز منگل

...

ممکن ہے، یہ اشارہ غالب کی شاعری کی طرف ہو۔

حضرت قبلہ گاہی، ولیٰ نعمی، مدظلہ العالی!

بعد کو قرض عرض ہے کہ میرے عہدوت نامے ہیم ہینچ کر کاشف احوال ہوئے ہوں گے۔ میں جناب سیکرٹری صاحب کی کلاش اور جناب نواب گورنر جنرل صاحب کا ملاقات کا حال بے گم و کاست لکھ چکا ہوں۔ نئی بات یہ ہے کہ گل، کہ رمضان کی تیسری تاریخ اور پیر کا دن تھا، حکومت لٹونانی وطنی سے ایک خط آیا۔ لکھا تھا کہ شعبان کی پانچویں تاریخ کو تھارامندر مسل کے کاغذات میں شامل ہو گیا۔ ہر چند کہ میں اس کا مضمون ابھی طرح نہیں سمجھ سکا، لیکن (یہ امر) میری عرض داشت کے مسل پر لگ جانے کی خبر دیتا ہے۔ قومی امید ہے کہ اس پختے میں کارفرما کی طرف سے کوئی خط یا وکیل کی جانب سے کوئی تحریر آ جانے گی۔ اور حال احوال سے مطلع کر دے گی۔

مزید یہ کہ نواب صاحب قبلہ و کعبہ سید علی اکبر خان بیلور شادی کی مسروریت سے فارغ ہو گئے ہیں۔ دربار کے دن چوں کہ لارڈ صاحب شربت نہیں لائے، اور ان کی جگہ میرے پہلو میں خالی رہی، میں نے ایک نیازنامہ بگلی بھیجا اور ان کے نہ آنے کی وجہ دریافت کی۔۔۔ مددوی کی تحریر سے ظاہر ہوا کہ وہ بیمار ہیں اور طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ چنانچہ میں عیادت کے لیے گیا اور پانچ دن اور رات بگلی میں رہا، چنانچہ گل واپس آ کر اپنے کعبہ احزان میں پہنچا۔ میرے عیاب میں گھر کی چوکی داری کرنے والے نے وہی سے آیا ہوا خط بچے دیا۔ اس میں وہی کچھ لکھا تھا، جو اوپر تحریر کر چکا ہوں۔ نواب صاحب گروے کی بٹری کے مارنے میں مبتلا تھے، لیکن جلد شفا یاب ہو گئے۔ ظاہراً... (کیا سی؟ بیماری) معمولی تھی کہ۔۔۔ (کیا سی؟) تھوڑے ہی وقت میں (رفع ہو گئی) فی الوقت مصاحبینِ مسند کے ساتھ یہ صحت و عافیت ہیں۔ (وما ہے کہ) حاضر کھدس قریبی سکون رہے۔۔۔ (ناکمل) سر بسر عرض کیا گیا۔

بگوان داس کے ہاے میں انھوں نے فرمایا کہ ہم نے پچھلے ہی معلوم کر لیا تھا کہ رومیہ انھیں۔۔۔ (قیاسی و جتنا ہنڈوی میں لکھا تھا) بگوان داس نے پہنایا اور مولوی صاحب یعنی اس قبل سے تحریر میں اشتباہ ہوا تھا، لیکن کتابوں کی فروخت کے سلسلے میں۔۔۔ معاملے میں کوئی رنگ رکھا (ناکمل)۔ میں نے لہنی، اور آپ کے خطوں کی، سہولت اس میں دیکھی کہ رحمت تحریر کو محدودی۔۔۔ کی انگلیوں کے پوروں پر جائز تصور کیا۔ چنانچہ ایک کاغذ پر اپنے دست خط کر کے لہنی عرض داشت میں منسلک کر دیا، آپ کی نظر سے گزرے گا۔

آئندہ کے دواوس میں سے یہ ہے کہ شنید ہے، برسات میں، جب دریا زوروں پر ہوتا ہے، نواب گورنر جنرل تمام افراد کو قتل اور اشخاصی حملہ کے ساتھ ہندوستان جانیں گے اور تین سال کے لیے صنایع میرٹھ، کہ دہلی کے قرب و جوار میں ہے، دارالسلطنت قرار پائے گا۔ اس صورت میں سارے متوطنین کو قتل، خواہ وہ کیل ہوں یا در خواست گزراں سب کے سب، اس قافلے میں ہم سفر و ہم دم ہوں گے۔ میں، کہ اگست کی تاب نہیں رکھتا، بھلا سفر کے لیے حوصلہ و سامان کہاں سے لائوں۔ کاش کہ مقدسے نے کوئی بستر کی راہ پکڑ لی ہوتی تو حکومت سے امانت کے طور پر کچھ قرض لے سکتا۔ یا ایسا ہوتا کہ حضرت قبلہ گامی خود ٹھیکے کی مشکلات میں گرفتار نہ ہوتے تاکہ میرا کام چلتا رہتا اور اس باب میں کوئی تنویر نہ ہوتی۔ اس وقت، کہ نہ وہ ہے اور نہ یہ، میرے جگر کا خون میرے داسی پر ہے اور جان آستین میں۔ کاش، نواب ذوالنظار بہادر کو یہ توفیق ہو کہ وہ مزید ایک ہزار روپیہ اٹھیں کرنا سے دلوا دیں۔ سوچ رہا ہوں کہ اس اسٹے جا پر مشتمل ایک عرض داشت جناب نواب صاحب کی خدمت میں تحریر کروں اور اسے اپنے خط سے منسلک کر کے جناب عالی کی خدمت میں بھجوا دوں اور آپ اس کو دیکھ کر مرزا مغل بیگ کے چھوٹے بیٹے مرزا اوڑبک جان کو کہ اسی طرح بیٹائی۔ (ناکمل)۔ اپنے پاس بلا کر اچھی طرح سمجھائیں اور اس بات پر آمادہ کر لیں کہ وہ اس مقدسے کی درستی کا اقدام کرے۔

\* سلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کے سلسلے میں غالب سے جو بات چیت ہوتی تھی، اس میں مزید کچھ پیش رفت ہوتی اور کوئی سودا طے ہو گیا۔

قبیلہ گاہا! یہ موت سے پہلے ولویلا اس لیے ہے کہ اُس قیامت میں ہمارا ماہ سے رات نہ فرست باقی نہیں اور وہ لوگ، جن کا میں حاجت مند ہوں، سخت بے پروا واقع ہوئے ہیں۔

لہٰذا تھی دستی کے غم کے بارے میں یہ عرض ہے کہ رمضان آپسٹھا ہے اور زلفہ تمام ہو چکا ہے۔ اگر لارڈ صاحب سے طکات شعبان میں نہ ہوتی تو رمضان اچھا گزر جاتا، لیکن رمضان کی عیاشی کی رقم گورنر جنرل اور سیکرٹری کی خدمت میں اور مہلے کے اہلکاروں کی خدمت میں صرف ہو گئی۔ ہر چند کہ یہ خرچ کھلے ہاتھ سے نہیں تھا، لیکن خفتِ مایہ نے اس ہنر کے باوجود مجھے نقصان ہی میں رکھا۔ غرض کہ پہلے تو اتنا روپیہ چاہیے کہ ان چار پانچ ماہ قیام کی کھات کرے اور اس کے لیے اتنی رقم ہی، کہ پہلے حمایت ہوتی تھی، کھات کرے گی۔ امید ہے کہ آپ بھیج دیں گے اور اس آخری بات پر اس کے لائق طور فرمائیں گے۔ مزید سوائے تسلیم کے کیا عرض کروں!

رؤسیاہ اسد اللہ، معروفہ چہارم رمضان، بروز منگل

\*\*\*

۱۹

۱۱

حضرت قبیلہ گاہی، ولیٰ نعمی، بِذِ قَلَمِ الْعَالِی!

ہوں کہ میرے سر میں یہ سودا سمایا ہوا ہے کہ عالمِ نبوت میں بھی ماضی میں شمار کیا جاؤں، البتہ میں نے گفت گو سے بھی نازک تر ایک پردہ بُنا ہے اور دنیا و مافیہا کا ہر واقعہ، جو نمودار ہوتا ہے، میں آپ کی خدمت میں پہنچا دیتا ہوں۔ مقصد یہ کہ... (ناکھیل) مارتا ہوں۔

جہاں یہ نواب گورنر جنرل بےاد و کاردار آراستہ کرنا، لدوی کا ان کی خدمت میں عشقِ عاشق علی خان کی بندہ نوازی کی وجہ سے ماضی ہونا، اور اس کے بعد میرا بگلی جانا، اور جنابِ نواب...



کے مدرسوں کے خط کے جواب میں مکتوب کا پہنچنا... توڑ پہنچنا (نا مکمل) اور ہر سمت سے مایوسی (کا اور آنا)، اراکلیگی کو نسل کے ارادوں کے پرمیوں کے ہاں ہندوستان کوئی کی خبر ملنا... (سفر کے لیے میرے پاس) ساز و سامان کا نہ ہونا، اس ضمیمہ تدبیر کے ساتھ، جسے ایک امید مہم کی بنا پر، جو دل میں سمائی ہے، آپ کی خدمت میں متواتر خطوط کے ذریعے تریر کر چکا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ (ان خطوط میں سے) ہر ایک ہر جانب سے پہنچ کر آج نہ آجلیں سے رنگ دور کرنے والا ثابت) ہوا ہوگا۔

آج، کہ جمعرات کا دن اور دھشتان کی تیرہ تاریخ ہے، ابھی ابھی ایک خط پاکستان وطن سے پہنچا ہے۔ اگرچہ اس خط کے لکھوانے والے قلم کی آجلیں کے مذاق سے اور تریر کرنے والا طرز (قیاسی، اظہار سے ناواقف ہے)، اس لیے مقصد کا اظہار مکمل نہیں۔ البتہ اس سے اس قدر سمجھ میں آتا ہے کہ مقدمہ اس عدالت میں پیش ہو گیا ہے اور حاکم نے اپنے کارپردازوں کو کام پر لگا دیا ہے۔ یقین ہے کہ چند دن میں وکیل کی طرف سے کوئی خط یا کار لیا کی جانب سے کوئی فرمان آجائے گا اور مقصد کے سراپا کی خلاصی کرے گا، لیکن... (قیاسی: چل کر) میں نے جناب عالی کو اس مقدمے میں خود سے بھی زیادہ، بلکہ زیادہ سے زیادہ دل چسپی لیتے ہوئے دیکھا ہے، وہ نا مکمل خط بھی (جو دلی سے آیا ہے) میں نے ارسال کر دیا ہے۔

آپ پر یہ پوشیدہ نہ رہے کہ ریڈیٹنٹ دو سری شعبان کو دلی پہنچ گیا ہے اور پانچویں شعبان کو میرا عرض و دعا اس کی عدالت میں پیش ہو اور وہ مکتوب، جو آپ کو ملے گا، انہیں شعبان کا تریر کردہ ہے۔ میں مصلحت اس امر میں دیکھتا ہوں کہ آپ ایک دوستانہ و بے غفانہ خط منشی محمد حسن صاحب کو لکھ دیں اور ان سے مقدمے کا حال معلوم کریں۔ اس لیے کہ میرا کار لیا ہرے سست قلم واقع ہوا ہے اور وہ خط بہت تاخیر سے لکھتا ہے۔ اپنے سر اور ایران کی قسم، اس کی یہ سست قلم بھی اس کے اعتماد و دوستی کی ایک شان ہے، ورنہ اس کے غیر محنت کو میں نے بارہا امتحان کی کوئی پر پرکھا ہے۔ قصہ مختصر، میں خوش ہوں کہ مقدمے کی ابتدا تو ہوئی اور اس میں کچھ دیر بھل تو شروع ہوئی۔

دیگر ہر طرح غیریت ہے۔ کل رات ایک غزل بھی ہے۔ یہاں کہ اس کے مطلع میں  
 ایک خاص بات تھی، اس لیے اس محبوبیت نامے کے اختتام کی زندگی بن گیا:  
 لوتِ حشم ز فیضِ بے نوائی حاصل است  
 آں چنان تنگ است دستِ من کہ، بنداری، دل است  
 [مجھے بے نوائی کے فیض سے اپنے حشم کی لوت حاصل ہے۔ میرا ہاتھ اس قدر تنگ  
 ہے کہ گویا (سیرا) دل ہے۔]

راقم اسد اللہ، معروفہ ۱۳۳۱ رمضان، جمعرات

میں لہنسی بھی کا خط، جو دہلی سے آیا ہے، اس عرصے کے ساتھ خشک کر رہا ہوں،  
 پڑھنے کے بعد پھاڑیں اور پانی اور آگ کے سپرد کروں!

\*\*\*

۲۰

۱۷

حضرت ولی النبی، مدظلہ العالی!

(ہمدی) تسلیات و کورنش کے بعد عرض گزار ہے کہ ہندوئی کا قلم جب تحقیق کے  
 بعد از قسم شاہ جوگ نکلا (قر) ہمدی مولوی ولایت حسن صاحب کے سپرد کر کے ان کے  
 غلاموں کے توسط سے کٹوفی کے چالیس دن کے پیسے منہا کر کے دو سو روپے وصول کر لیے  
 گئے۔ عاقر اقدس ہر صورت جمع ہو رہے۔ اراکین کو نسل کے عزم کے جھنڈوں کی شد  
 کشائی۔ (ناکمل) بروز ہفتہ، بتاریخ ستائیس شوال، ہمدی جناب شمس ماسق علی خان بہادر  
 غفلت کردہ راقم پر تھریٹ لائے۔ اپنے نام کا خط دیکھا۔ افسوس کہ جناب مدوح شعلی  
 سہارت سے سبک دوش ہو گئے ہیں اور ان کا استعفا۔ منظور ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ



نظرِ حمایت رکھنے میں اور توفیق یہ ہے کہ آپ کے دعووں کی تفتیش و تحقیق کر کے صدر دفتر کو رپورٹ بھیجیں گے۔

فرض بات یہاں پر ختم ہو گئی۔ میں نے سلام کیا اور واپس گھر آ گیا۔ کل، کہ سوال کی تیسویں تاریخ تھی، صبح سے دوپہر تک وکیل کے خط کا جواب، فرماندہ کل و وطن کو خطوط، حاکم کے گرامی نامے کا جواب، اور ایک مکتوب در جواب۔ (ناکمل) خشی صاحب ریزیدنٹ کی خدمت میں پہنچانے کے لیے لکھ کر اور دن کے اختتام پر سپردِ ڈاک کر دیا۔ چوں کہ لکھ کر (سیرا ہا تھ شک چکا تھا۔ (ناکمل)۔ آپ کی خدمت میں کوئی عرضداشت نہیں لکھ سکا۔ آج، کہ بدھ کا دن ہے، ذی قعد کی پہلی تاریخ۔ یہ ساری باتیں لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ مزید تسلیم کے حلقہ کیا عرض کروں۔ عزیزوں کی خدمت میں مودِ جہات پہنچیں۔

• • •

۲۱

۱۶

حضرت قبلہ گاہی دہلی، مدظلہ العالی!

میری جبین اس آستان کے خیال میں سجدہ ریز اور میری سانس اس قبلہ راستا کی آرزو میں شعلہ خیز ہے۔ (لہووی) عرض کرتا ہے کہ وہ عبودیت نامہ، جو جناب کے خط کے جواب میں پہلی ذی الحجہ کو ارسال کیا تھا، چوں کہ آج صبح کی آٹھویں تاریخ ہے (سو) ایک ہفتہ۔ اس کلمہ مقصود پر گزر گیا۔ جلیل الزناقب مولوی ولایت حسن صاحب نے مجھ حاکم کے کھاسے قیام پر اپنے۔ (قیاسی: درود) کی روشنی ڈال کر غم خانے کے درود یار کو مطلع انوارِ سلوت بنا دیا۔ بخدا، (میں نے) ابن بزرگوار کی ملاقات کو جو ظاہر و باطن کی خوبیوں سے آراستہ ہیں، غنیمت سمجھا اور جناب کی عنایات کا کھکر لہسنی استعدا لو سے زیادہ لوا کیا۔ فی الوقت

کوئی ایسی بات نہیں ہوتی کہ قابلِ تحریر ہو۔ البتہ ایک حیرت انگیز بات، جو یونانی جہود الفروز ہوتی ہے، یہ ہے کہ لایع النور، نواب مطلق القاب نواب ذوالفقار بہادر دام شوکتہ کا ایک مکتوب، جو (سیرے) قطع عرض داشت کے جواب میں تھا، ایک نعمتِ طہیر مقررہ کی صورت اہلک آجپنا اور اس نے میری عاجزی کو ایک اور ہی عزت عطا کر دی۔ ہر حال پہل ذی الجہ کا بھیجا ہوا خط مقصد کے نقوش کا آئینہ دار ہو گا اور صاحبانِ کونسل کے حکم اور اس سے متعلق جو کچھ بھی واقع ہو گا، آئندہ خط میں آپ کی خدمت میں پہنچے گا۔

\*\*\*

۲۲

۱۹

حضرت قبلہ گامی، ولی نعمی، مدظلہ العالی!

آپ کے سر پر سے قربان ہونے کے بعد، خوات سے آنکھ پٹت پا کو سیتی ہے اور بلا خوف سے زیرِ لب کٹ کٹ کر آتا ہے۔ میں کس قدر بے کس نہیں کہ مراسمِ ہزار خواہی پر میں مجھے خود ہی لہنا شلیج ہونا پڑتا ہے۔ خدا کے واسطے، غالبِ زہراب نقوش کی تلخ کاسیوں پر کچھ (خوارم کیجیے۔ اُس خدا کی قسم، جو ناند نیار کا پیدا کرنے والا ہے، آپ کے والا نام سے کی سیاہی سے نظر جب آشنا ہوتی اور القاب "قبلہ صبر اں سلامت" نے مغز جان میں ایک ایسا فشر پیوست کر دیا جو مدی زندگی جب جب یاد آئے گا، دلِ ہجر کی آواز کے خوف سے برگِ بید کی طرح لرزے گا۔

میری عرض داشت، جو برلورم کڑی مولوی ولایت حسن صاحب کے خط میں مضمون ہے، آپ کی نظر سے گزر کر میرے سوا سونہ کی غلامی کرے گی۔ اگر جنابِ عالی مجھے (لہسنی) فرزند ہی میں قبول نہیں فرماتے تو ایک خریدار ہوا غلام ہی شمار کر لیں اور ہاؤناہار "قبلہ"

مہجورانِ سلطنت کی محنتی میں ایسا انتہابِ تحریر فرمائیں کہ اس ننگِ آفرینش کے لیے ہمارے  
افتخار و ستائش ہو۔

گر تو مرا نہ خواہی، میں خویش را بسوزم

ہمارے کہ آپ نبوی روزے کہ ہاؤ ہاؤ

[اگر تو مجھے نہیں چاہے گا تو میں اپنے آپ کو جلاؤں گا، کسی ایسی جگہ پر جہاں پانی نہ  
ہو، کسی ایسے دن (کہ صرف) ہوا ہو۔]

اس خط میں بھی میں نے اپنا مختصر حال... (قیاسی: گھد دیا ہے...) اس عرصے میں کچھ تو  
روپے کے زور سے اور کچھ سنی و حدیث سے میں نے فرمان وہ دلی کی رپورٹ کی نقل ضمیمہ حکم  
کے ساتھ... حاصل کر لی ہے، جس کو اس خط سے منسلک کر کے آپ کی خدمتِ عالی میں بھیج  
رہا ہوں۔ چوں کہ اس مکتوب کی تحریریں... پانی سے وضو دینے یا آگ میں ڈال دینے کے  
بہم معنی سمجھی جاتیں۔ وکیل کا مکتوب دلی سے ابھی تک نہیں پہنچا کہ کوئی تازہ خبر... لیکن  
(مذکورہ) سمیٹنے سے یہ آشکار ہوتا ہے کہ وکیل کے مکتوب کی تاخیر نہ (تو) خوش خبری دینے  
والی ہے، نہ (ہی) ڈرانے والی۔ ایک ہفتہ ہو گیا کہ... سے اور ہندوئی اکبر آباد سے پہنچی ہے۔  
جب حاصل کر لی تو پتا چلا، ہار سو پندرہ روپے کی تھی۔ رقم وصول ہو گئی اور جواب میں نے  
اکبر آباد بھجوا دیا۔ ملتان کی حضرت قبلہ گاہی کی صلا سے ابھی کچھ (رقم) پائی ہے اور کاروانی  
کوئٹہ کے کوچ سے پہلے اپنی کام پائی کے لیے امیدوار... (قیاسی: ہوں...) بند گاں  
خداوندِ نعمت، میری طرف سے اپنی خاطر جمع رکھیں کہ (میری) حالتِ اضطراب ایسی نہیں کہ  
مہجور... (قیاسی: غرض لینے پر) اصرار... کوں اور خواب کی بزم کے اراکین کے سامنے بمبک  
مانگنے کو ہاتھ پھیلاؤں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ آئندہ ان لوگوں سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ  
کریں گے، لیکن اس راز کے پردے کے حرم بستر بگھٹتے ہیں۔

منشی عاشق علی خان، بھلی دہی، الجہ کو گلشن سے دریا کے راستے چلے گئے، البتہ سمت معلوم  
نہیں ہو سکی۔ حکیم غفر علی خان، جو اہرامِ فیض آباد میں سے ہیں، ان کی جگہ عبدِ سعادت پر

ہاور ہو کر آئے ہیں۔ مولوی عبد الکریم، جو آغواہ کی رخصت پر لکھنؤ چلے گئے تھے، واپس آ رہے ہیں اور عظیم آباد تک پہنچ گئے ہیں۔ غالباً اس ماہ کے آخر میں گلشن پہنچ جائیں گے۔ منشی محمد حسن دہلی پہنچ کر اپنے کام پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اپنے صدمے پر قائم ہیں۔ نواب علی اکبر خان بہادر خدام کی کشاکش سے، جو اب سے پچھلے تھی، آڑلو ہو گئے ہیں۔ ناکہ مسند آرائی۔ (ناکمل)۔ بھلی بندر میں ہیں اور اکثر ویش تر اسم بھیج کر بدوش کی خوش خبری پہنچایا کرتے ہیں۔ زیادہ عذر نواب!

عرض داشت اسد اللہ

\*\*\*

۲۳  
—  
۲۴

قبیلہ خوانمہ یا ہیسیر، یا خدا، یا کعبہ آت  
اصطلاح شوق بسیار است و منی دیوانہ ام

[میں تجھے قبیلہ کہوں، یا ہیسیر، یا خدا، یا کعبہ، (کیا کہوں)، شوق کی اصطلاحیں بہت ہیں  
اور میں دیوانہ ہوں۔]

حضرت قبیلہ گاہیں، ولی نعمی، بِرَافِظِ العالی!

... (قیاسی: عبادت) بیلور خورشید دُڑے پر فرض ہوئی اور دریا کے آداب کی رعایت  
قطرے پر واجب (آئی)۔ دُڑے نے خود کو نور خورشید سے موجود۔ (قیاسی: سمجھ کر) حیرت  
کی عکاسی کی اور احسان شناسی کی گوند میدان سے لے گیا۔ قطرے نے جب سمندر کے  
دبے بے کو سمجھ لیا تو سرسید ہو کر اپنے وجود کو گم کر پیشا اور داغ۔ پہنچایا۔ میں بھی چوں کہ  
اہل فنا کے شیعہ و ذوق سے واقف ہوں، مرا تہبِ عبودیت کے اظہار میں میں نے خود کو گم گم

پایا ہے۔ میں دعا (کے لیے) گیا (ناکمل)۔ ریویسٹ نامہ پہنچا۔ بسا ہوا پانی نہریں اور لڑا ہوا رنگ پھرے پر واپس لے آیا۔ میں وکیل اور۔ (قیاسی: مظہرے کی سماعت) کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن لوب نے تھامنے کی عٹان پکڑ لی اور تسلیم نے ہرزہ نویسی سے روک دیا۔ (قیاسی: ایک شعر) اپنی غزلوں میں ہے، جو مٹائے شوقِ ناز کی آئینہ داری کرتا ہے، پیش کرنا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں۔

فرسندی غالب نہ بود زنی ہر گفتنی

یکبار بفرمے کہ اے بیچہ کسی ما

[غالب اس لفظی سے خوش نہیں ہوتا۔ بس، ایک بار یہ کہہ کر پکار کہ اے ہمارے بے حیثیت (شخص) !]

برادرم مکرمی و ہمدومی حضرت مولوی ولایت حسن صاحب کے نام کا خط مکتوب الیہ۔ کی خدمتِ رفعات و درجات میں پہنچا دیا گیا، لیکن طہانانِ لوب صاحب کے نام کا خط بدستور میرے پاس ہے۔ چوں کہ نامہ مبارک کے پہنچنے سے۔ دو روز قبل ہی راقم کی سرکاری کی لیے پہنچا تھا۔ اس کی ہر سطر کی رنگ سے اس لفظ کے ساز کا ابر چشم (نکل رہا تھا) کہ لوب صاحب قبلہ عزم کے حشرے کے بعد گلشنِ شہریعت لائیں گے۔ چوں کہ آج فوری عزم ہے، غالباً اسی بٹنے میں مجھے پابوسی جنابِ مدوح۔ کی سعادت ملے اور گراہی نامہ میرے اعتبار کی بندی کی سند قرار پائے۔

اس شہر کا احوال، کہ میں جس کے خاکِ نشوون میں ہوں، اس طرح ہے کہ کوئٹہ کا کوچہ و سوے۔ (قیاسی: دلی) معمولتِ مختلف۔ (ناکمل)، (قیاسی: مختلف لوگوں کے مطابق مختلف تاریخوں میں ہے)، لیکن اختلافِ مذت میں ہے، حرکت میں نہیں۔ ہمدومی صاحبِ اعظم جنابِ مولوی عبد اگر کم صاحب سفر سے واپس آگئے ہیں اور اپنے دفتر کی ترتیب میں مصروف ہیں اور چوں کہ انہوں نے میرے مجوزہ انگسار کا مزہ چا لیا ہے اور (ساتھ ہی) میرے مقصد کی قسمت میں انہیں آئندہ روشنی نظر آئی ہے، انہوں نے میرے ساتھ جاسد و کفہ



کا پردہ اٹھا دیا ہے۔ برادر محمدوی سلامی حضرت مولوی ولایت حسن صاحب ایک روز فرماتے تھے کہ "میں عشرہ محرم کے بعد دورے پر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

بظاہر نئے قوانین کے قیام کے آشکار ہونے میں وقت لگے گا۔ وہ صدر نشین، جو اس وقت مانجھ محمد ہے، نہ معلوم کن مسائل سے دوچار ہے اور آئندہ کیا کرنے والا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ اس کے ہم نشین بھی اس کی نگاہی سے عاجز آکر اس کی طاقت میں یک جا ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سرزد ہوا ہے۔ چوں کہ بے مزہ نہیں ہے، اس لیے تحریر کر رہا ہوں۔ کہتے ہیں کہ چغل خوروں نے کونسل کے ارباب دانش تک یہ بات پہنچائی کہ۔

اطراف و جوارب کے مانجھ نذر کے طور پر مردارید منگواتے ہیں اور تھے (کے لیں دین میں)، جو رشوت ہی کی ایک صورت ہے، ہزاروں اور لاکھوں روحوں کو مر سے لیتے ہیں۔ چنانچہ حکم ہوا اور ہر ملائے اور بستی میں، اعلان کر دیا گیا کہ رسم نذر و پیش کش باطل قرار دی جاتی ہے اور بطور تحفہ لائی جاتی چیز، ہا ہے کلینٹا پھلوں کی ٹوکری اور صبری کا ایک طبق ہی کیوں نہ ہو، سو قوت و مصنوع کی جاتی ہے۔ عقل سلیم جانتی ہے کہ اس طرح خوف زدہ کر کے حکام کو رشوت ستانی سے روکا نہیں جاسکتا۔ اس فیصیح کو بچوں کے کھیل سے زیادہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

اس قوم کے بلند ہمت لوگ اور اس قبیل کے خود پسند افراد جو لڑخی بلند ہمتی کے زور پر عام حقوق سے سوائے قوانین کے اور کچھ نہیں چاہتے تھے اور خود پسندی کی بنا پر اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز تصور کرتے تھے، اس حکم کی غلطی سے سنت پر ہم ہو کر متحہ ہو گئے ہیں، اور لدوی کی رائے میں یہ درست بھی ہے، چوں کہ اس حکم سے رعایا کے درد کا دلو تو ہو نہیں سکتا، (اوش) حکام کے دلوں میں ایک ہیٹ بیٹھ گئی ہے۔

تصویر یہ کہ جب کاروبار چلا گیا، نذر کی رسم ختم ہو گئی۔ جس طرح اس بارگاہ میں سارے دھلا اور سارے اہل ہار سال میں تین بار، کہ دو عیدوں اور ایک بڑے دن سے عبارت ہیں۔ منصف مسٹر لینڈریو اسٹرنگ بساور کی خدمت میں نذر پیش کیا کرتے تھے، جو اگرچہ قبل نہ کی جاتی تھی لیکن ایک عہدہ رسم اور اچھی۔ عمل میں نہ آئی (ناکمل)۔ غالب آشفہ خوا نے جب کام کا یہ ڈسٹنگ دیکھا تو ایک رہائی سمجھ کر منصف بد کوہ کی خدمت میں گزرائی

... محبت کا شہد لپٹا ہوا تھا اور ممدوح کے مذاق کا یہی شیوہ ہے۔ کیا بتاؤں کہ اس کی فطرت میں گلشنی کے کیسے (لطیف) رہے۔ (قیاسی: پنہاں) تھے کہ... (قیاسی: رہا می نے) اس کی پیدائشی کو جانے کی طرح تاباں کر دیا۔ ہونٹوں پر تبسم (لا کر)، آنکھوں میں محبت (بھر کر) اور زبان کو ستائش سے تر کر کے اس نے کہا کہ "زہے عزیزِ مخلصانِ صادق۔ نہ منع ہی کر سکتے ہیں اور نہ ہی صاف،" اور وہ رہا می یہ ہے:

سر تا سرِ دہرِ بارخ و بہتانِ تو باد  
صد رنگِ گلی (طربِ پیچہ ڈالیں تو باد)  
عیدِ است و بہارِ خوشِ دلی با دلد  
جانِ من و صد چو من بہ قربانِ تو باد

[سارا نا نہ تیرا بارخ و بہتان ہی جانتے۔ تیرے دامن میں طرب کے سیکڑوں رنگ کے پھول ہوں۔ عید ہے اور اس میں خوش دلی کی بہاریں ہیں۔ سیری جان اور مجھ جیسے سیکڑوں تیرے پر سے نچا کر ہو جائیں۔]

صلیٰ کا احوال کہ میری جان و دل اس میں رہی ہیں۔ اس کا تھمنا ہے (ناکمل)۔ قوی امید ہے کہ عرضِ داشت کا مستند بودِ عید کی تحریر سے ضمیرِ شیر پر واضح ہو گیا ہو گا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ۔ سر اسر نرم مزاج سائل ہے اور مضمون... اور اس کے ساتھ فی الوقت مراتبِ اولو خواہی کے اقلید میں سوائے خواجہ حاجی کی کیفیتِ استحقاق کے غصہ کے اور مستحقینِ نصر اللہ بیگ خان کی مہذبِ بازیافت کی تحقیق کے۔ (قیاسی: مہذبے میں ملے کرنے کے لیے) کوئی دوسرا عقدہ نہیں ہے۔ نہ معلوم کیا پیش آیا کہ دہلی کے حاکم نے ابھی تک مہذبے کی طرف توجہ نہ کی واضح رہے کہ۔ (قیاسی: حاکمِ دہلی کا) وہ حکم، جس کی نقل حرف بہ حرف میں جنابِ والا کی خدمت میں ارسال کر چکا ہوں، ماہِ اپریل کے وسط میں دہلی کی جانب نظر پڑا ہوا۔ میری فکر کے مطابق، اپریل کے آخر میں دہلی پہنچا ہو گا۔ آج تک، کہ وسطِ جولائی ہے، اُس سارے کوئی آواز نہیں ابھری۔ جو کچھ وکیل کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے

ہی الجہ کی ساتویں تک، کہ جون کی دس تاریخ تھی، حاکم نے کوئی استفسار نہیں کیا۔ نہ معلوم اس ماہ کے عرصے میں۔ ہی الجہ سے عزم کی آٹھویں تک گزر گئی، کوئی تحقیق ہوئی یا ابھی تک منصف خواب میں اور دلوں خواہ اضطراب میں ہے۔ اگرچہ مجھے اس تھی دوستی سے یک گونہ بے خطری حاصل ہے اور اس جگہ کی آب و ہوا بھی مجھے آب و ہوا سے وطن کے مقابلے میں زیادہ راس ہے، لیکن فرمان وہ دلی کی رپورٹ اور صدر دفتر کے احکامات کا نمونہ (مزید) قیام کا مستثنیٰ نہیں۔

امید کرتا ہوں کہ حضرت قبلہ گاہی مثنیٰ محمد حسن صاحب کو ایک خط لکھیں گے اور ان سے دوبارہ پوچھیں گے کہ کیا وجہ ہے، کہ باوجود اس کے کہ ریڈیو سنٹ ہلوار نے اپنے خط میں امداد کو صدر دفتر کے حکم کا امیدوار بنایا تھا اور صدر کا حکم ہر صورت سے سائل کی مرضی کے مطابق صادر ہوا تھا اور اس کو بھی تین ماہ گزر گئے، رکاوٹ کس جگہ ہے اور تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟ قبلہ گاہا! آپ کو اس خبر کے پہنچانے سے ہمدردی کا دتا جا رہا ہے کہ اگر میں جان لوں کہ میرا وکیل لاٹا ہالی ہے تو اس کی کارروائی کے لیے۔ (قیاسی: اس شخص کو کھوں، جس کے ذریعے اس کو وکیل مقرر کیا گیا ہے) اور جو میرے لیے اور میرے کام کے لیے میرا طرح (ہے) اور اس کو آگاہ کروں تاکہ وہ وکیل کو جنبش امداد اور گوش چشم سے آزاد ہر عمل کرے اور اگر حاکم ہی فی الواقع لیت و لعل کر رہا ہے تو اس کے سامنے شہادت لے جا کر۔۔۔ (قیاسی: طلب انصاف) صدر سے کی جائے۔ چوں کہ استکار کی بدلت، جو تین ماہ تک پہنچ چکی ہے، اب گزر چکی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ روز بروز عرض داشت۔۔۔ (قیاسی: آپ مثنیٰ محمد حسن کو خط) بھیج دیں گے۔

خط کے آخر میں ایک سطر کہ جناب نواب مستثنیٰ عنی اللعاب کے محرموں کی غم خواری کی خبر رکھتی تھی۔۔۔ ان کی زبان سے میرے حال کی منظر ہے اور میری عرض داشتوں کے پہنچنے کی خبر دینے والا ایک رقم، ایسی عہدت کے ساتھ کہ۔۔۔ \* اللہ بس، باقی ہوس!

اُس لام ہاڑے کی، جو جنابِ مستطاب حضرت اقصیٰ القصاص علیہ الرحمۃ والعترا کے مزارِ کثیر الاولاد کے قریب ہے، بنیاد رکھنے کی تاریخ۔ (کلیسی میں لے کر لی ہے:)

جہں سہی مدنی عالیٰ بزرگوار  
 طرحِ لام ہاڑہ عالیٰ سپر سا  
 رضوانِ ذِ عقدِ نور بر آں (ہام و در) فشانہ  
 تا گشتِ سخت و سنگ جو آئندہ رُو نما  
 رحمتِ چنے بساطِ دد آں بزمِ عزیزیت  
 آلودہِ اطلسیٰ سیاہ از سایہِ بہا  
 رفتم نیازمند سروشِ فیض  
 گشتم کہ پدہ از رُخِ تاریخِ برکت  
 و "عزیزیت سراے" بزرگوار "نالہ" و گنجت

۱۱۵۸ + ۸۶

ایں است سازِ فقرِ تاریخِ ایں ینا

[جب سہی مدنی عالیٰ بزرگوار میں آسان جیسے بلند لام ہاڑے کی بنیاد رکھی گئی۔  
 رضوان نے جنت سے اس کے ہام و در پر نور پھرا، یہاں تک کہ اس کے  
 سنگ و سخت آئینے کی طرح رُو نما ہو گئے۔

رحمت اُس بزمِ عزیزیت میں بساط کے لیے سایہ بہا کی سیاہ اطلس لائی۔  
 میں نیازمند سروشِ فیض کے سامنے گیا اور میں لے کر کہا کہ تاریخ کے پھرے سے پدہ

بشاوے۔

\* حاشیہ متعلقہ پہ صفحہ گذشتہ!

باقی عبارت کا مفہوم صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ جہں کہ اس خبر میں مقصد کی کوئی لویہ  
 نہیں ہے، اسی لیے میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کر تا ہوں کہ بے جواب ل گیا ہے۔

اس "تغزیت سراسے" میں اس نے "نار" کیا اور کہا، اس ہنسیاؤ کے لفظ تاریخ کا ساری ہے۔]

جب لفظ ("نار" کے ابدال) "تغزیت سراسے" کے ابدالو (پر) بڑھائے جائیں تو ۱۲۳۳ ہجری میں گئے۔\*

اس مسجد کی تاریخ کا قلعہ، کہ وہ بھی اسی لام ہائے کے صحن میں ہے:

صحنی لام ہائے و مسجد ہر آن کہ دید  
در کربلا زیارت بیت المرام کو  
مطلق محل از چہ تاریخ آن بنا  
ایما بہ سوسے من ز رو احترام کو  
مکتوم توستے بدرد، "خوشا خانہ خدا"  
حد خشکیں دے کہ نظر در کلام کو  
خاکاک زلفت و پاسے لوب در گلنہ رفت  
ایہام را بہ قرعہ معنی تمام کو

[جس شخص نے بھی لام ہائے کے صحن اور مسجد کو ڈیکھا (گواہ) اس نے کربلا میں بیت المرام کی زیارت کر لی۔

اس عبارت کی تاریخ کے لیے مطلق محل نے احترام کے ساتھ میری طرف اشارہ کیا۔

\* یہاں جو عبارت ہے (چون حد لفظ "تغزیت سراسے" ہزارند ۱۲۳۳ ی شوق) اس سے بات الہد جاتی ہے اور مطلوبہ عدد حاصل نہیں ہوتا۔ یہ سید کاتب معلوم ہوتا ہے۔ غالباً اصل عبارت یوں ہوگی: چون حد لفظ "نار" بر حد لفظ "تغزیت سراسے" ہزارند ۱۲۳۳ ی شود۔

"تغزیت سراسے" کے ابدالو ۱۱۵۸ ہجری جب "نار" کے ابدالو ۸۶ بڑھائے جائیں تو ماضی جمع ۱۲۳۳ ہجری ہوتا ہے۔

میں نے جب فی البدیہہ "خوشا خانہ خدا" کو میرے کلام پر نظر ڈال کر ذرا (سی) ور کے لیے ناراض ہو گیا۔

اس نے کوڑا کرکٹ صاف کر دیا اور پاسے اوب کو گلے میں ڈال دیا۔ ایہام کو خارج کر کے معنی پورے کر دیے۔

جب "خوشا خانہ خدا" کے اعداد سے لفظ "خاکاں" کے عدد نکال دیں تو ۱۳۳۶ لگتے ہیں، اور جب دو عدد "اوب" کی "ب" کے، کہ "ریختہ" پاسے اوب" سے اس کا اشارہ ملتا ہے، (نکال دیں) تو ۱۳۳۳ رہ جاتے ہیں، اور یہی (عدد) چاہیے تھا۔ عزیزوں کو واجبات پہنچیں۔

معروضہ نویں مزمع، جتنے کے دن

...

۲۳

۲۵

قبلہ گاہ!

بست سے فتنے، جنہوں نے کہیں گاہ سے سر نکالا اور بست ہی عقد ہے، جو کام میں پڑ گئے، خرد و شن سے "میں نے اپنے رب کو اپنے عزام کی شکست سے پہانا" کے ذریعے مکمل کئے۔ "لیکن میں جانتا ہوں اور میرا دل کہ میں کس قدر احسان مند ہادی بنت۔ می آید (ناکمل)۔ طبع ہوس پیشہ کے لیے یہ کمزور ہے، دیا اپنی فطرت میں ایک موج رکھتا ہے، مگر سنا یہ سمجھتا ہے کہ... (ناکمل)۔ یہ واقعہ تفصیل طلب ہے، لیکن راقم اس میں طرز اختصار کو

\* حضرت علیؑ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے: "عرفت رقی بفتح العزائم۔" یعنی "میں نے اپنے رب کو اپنے عزام کی شکست سے پہانا۔"

لمحوظ رکھے گا۔ دہلی سے ایک خط اس بے حیثیت کے لیے آیا ہے۔ منصف نے جو فرمایا ہے، میں نے جناب قبلہ کبھی کو اس کی اطلاع دے دی ہے۔ اور اس کے بعد قتل... آخری طریقے سے حاصل ہو گئی۔ میں اس انتظار میں تھا کہ اب ثانوی رپورٹ دہلی سے آئی، اور خدا کی قسم، انتظار... لیکن عجب مقصود بات ہوئی اور رپورٹ آج تک نہ پہنچی، اور وطن کے معززین کی قریر سے معلوم ہوا کہ... کہ سات ذی الحجہ تک کے مطابق تھی، کوئی باز پرس درمیان نہیں آئی۔ میرا حال دگر ہو گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ ظاہر ہوا کہ نہ حاکم... (کیا سی) نے سستی کی ہے اور نہ ہی مدعی کے وکیل سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے اور نہ ہی حکم سرکار قورٹ کا مقتضی شاہد نظر بہ حال... رسیدہ (ناکمل)۔ اس کے دشمنوں نے اس پر چند سختیاں لگائی ہیں، اور اس لیے وہ فی الوقت ایسی خدمات مغفوضہ انجام نہیں دے رہا اور جب تک ان الزامات کی تحقیق مکمل نہیں ہو جاتی، یہی حال رہے گا، اور اگر (تحقیقات کے نتیجے میں) بے گناہ و پاک نکلا تو اپنے عہدے پر بحال ہو جائے گا ورنہ اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی آ جائے گا، اور آج تک یہ معاملہ طے نہیں ہوا ہے۔

اگست کی پہلی تاریخ کو، ہفتے کے دن، لارڈ صاحب نے دربار عام کیا۔ سلام کرنے والوں کو دعوت دی۔ سب ہم مرتبہ لوگ گئے۔ میں بھی گیا اور دوسری نمبر پر نواب اکبر علی خان کے بعد دستور کے مطابق پیشا۔ یہ ملاقات دوامی تھی، یعنی اس سے مشعل ہی نواب علی القاب کی ہندوستان کی جانب حرکت کی خبر پھیل گئی۔ ستمبر کے مہینے میں، کہ اس کے شروع ہونے میں سترہ اشارہ دن باقی ہیں، دفتر بھی دیر کے راستے روانہ ہو جائے گا اور اکتوبر کے آخر میں لارڈ صاحب بھی ڈاک کے ذریعے، یا دفعتی جہاز سے، کوچ کر جائیں گے۔ واضح رہے کہ دفعتی جہاز اس جماعت کی لگھاو ہے، یہ تیز رفتار ہے، چنانچہ اکثر (ویجھا گیا ہے) کہ دفعتی جہاز گلشن سے الہ آباد دو ہفتے میں پہنچے ہیں۔ غرض کہ ان حالات میں میں نے یہ سوچا کہ دو تین ماہ میں دہلی سے رپورٹ کے پہنچنے کی امید نہیں کرنی چاہیے۔ مجھے گلشن میں پیشا رہنا نہیں چاہیے، بلکہ اس قافلے سے پہلے کوچ کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ منصف کی مرضی... تھی۔ بحال، میں منصف سے دواغ ہوا۔ کتنی مینا کی اور ساعلی باندہ تک پہنچانے کا طے کیا۔ میں





اطلع دینے کی خاطر لکھ دی ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ اگر ان دونوں حضرات میں سے کسی ایک کا خط بھی آپ کو ملے تو اس کا جواب کا تب کو ضرور لکھیں گے کہ میں نے ان دونوں حضرات کو ایک کو تحریر سے اور دوسرے کو تحریر سے، آپ کی ملاقات کا آرزو مند اور آپ کی محبت کا شناسا بنادیا ہے۔

\*\*\*

۲۵

۲۶

مرقی بے کساں، (خدا آپ کو سلامت (رکھے)۔

تسلیم کے بعد عرض ہے کہ آدمی کا نہ ملنا غالب کی بے کسی کے مقتضیات میں سے ہے۔ جناب عالی اس سلسلے میں رحمت نہ فرمائیں۔ بالخصوص وہ اشیاء جو میرے سامان میں ہیں، ممکن ہے، چور کے لیے قابل قبول نہ ہوں۔ اس حیثیت سے میں گشتی میں ہم سفریوں سے خوش اور وہ زخموں سے محفوظ ہوں۔ لکھ صرف بار بردار کی ہے اور بس! چوں کہ نواب صاحب والہ نقاب بھی مسافرت میں۔ پڑ گئے ہیں۔ خواہ مست حالت ہی کیوں نہ ہو، ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر بار بردار کی مدد اور اعانت۔ بنانا ہے (ناکمل)۔ میری خواہش یہ ہے کہ راقم کے خواہر ماشوں میں سے کوئی شخص، یعنی آپ کے در دولت کے ملازموں میں سے کوئی ملازم، کو قوالی چہو ترے میں جا کر شہر شہر سے، جو مجھ سے نا آشنا ہے، جناب کی جانب سے۔ کہ اگر بنارس تک ملے ہو تو بہتر ہے، ورنہ لاہور یا لاہور کا حکم دے دے۔ جہاں کہ میں نے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے کہ اگر۔ (ناکمل)۔ کل صبح سفر شروع کیا جائے۔ جہاں کہ مشورہ ہے کہ جمعرات کے دن سفر سہارا کہ ہوتا ہے، ورنہ کل اپنے سامان میں سے کچھ سامان۔ آپ کے دولت خانے بھیج کر مجھے کی صبح آپ کی خدمت یوسی کے بعد سفر پر روانہ ہو جائی گا۔

مکاتبات۔ جو آج عنایت ہوگی، بے کار درخواست ہے۔ "سیرتج بدایہ فیہا ایک نسخہ اور رسالہ تصوف بھیج رہا ہوں۔ سوائے نیازمندی کے زیادہ۔" (قیاسی: اور کیا عرض کروں؟)

محمد اسد اللہ

\*\*\*

۲۶

۲۷

حضرت قبلہ گاہی، مدظلہ العالی!

گلشنہ بھیجنے کے لیے ایک خط ارسال کر رہا ہوں۔ میرے خواجہ تاشوں میں سے کسی کو یہ حکم دیا جانے کہ اس کو ڈاک خانے پہنچا دے اور حصول ادا کر کے رسید لے لے۔ قوی امید ہے کہ میرے چند پاپا بوسی کو پہنچا دیں گے۔ زیادہ ہمارا تسلیم کیجیے اور آباد (?) چوں کہ میری طاقت اس مرحلے پر تمام ہو چکی۔

\*\*\*

۲۷

۲۸

قبلہ گاہی، بے کسلی پناہ!

صبح ہٹا سے میں اور آدھا دن ظلم گھسانے میں گزر گیا۔ افسوس کہ میری آنکھیں اس کھٹ پاکو نہ دیکھ سکیں۔ دن کے اختتام پر نواب صاحب کی مسند بوسی کی نوید ہے اور رات کو اپنے ساتھ تمکین پانی کے ساتھ کھانے کی دعوت (دی گئی) ہے۔

کل صبح اگر میں اپنے بستر سے زندہ اٹھا تو قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ حسب وعدہ خط بھیج دیا ہوں۔ میں نے اسے نازک پہلو بازی ہے۔ چوں کہ میرا آدمی ڈاک خانے کے قوانین اور مابطلوں سے ناواقف ہے، (اس لیے) امید کرتا ہوں کہ خط کا اچھی طرح مساندہ کر کے ایک آدمی حامل مکتوب کے ساتھ حزر فرماویں گے جو خط ڈاک خانے تک پہنچا دے اور پورا مصلیٰ دلوا دے اور حسبِ کاہدہ رسید بھی لے لے۔ زیادہ تسلیم!

اسد اللہ

\*\*\*

۲۸

۲۹

ابو حضرت نواب صاحب، قید و کعبہ گوئیں، بد نظارہ عالی!

(اپنی) پیشانی کو (آپ کے) آستانے کی جوس میں سجدہ ریز اور اپنی سانس کو غم خواری کے احسان کے اظہار کے فوقی میں زمرہ خیز کر کے (لہوئی) عرض کرتا ہے کہ حکم جہادی اللہ کو، مجھے کے دلی، پاندے کی منزل پر پہنچا اور اُسی روز جناب عالی کا نامہ مستور مقصود کا غورستان بن گیا۔ میں نے اس دنیا کے پیدا کرنے والے منصبِ یگانہ کی خدمت میں نماز ادا کی اور (اپنے) بختِ بلند کا ٹکڑا ادا کیا۔ (کہا) مجھے بے کس نہیں چھوڑا گیا اور اپنی درگاہ کے منتخبین کو میری دل جوئی پر مقرر کیا ہے۔ خدا انھیں سلامت رکھے اور تلویرِ زندہ!\*

-- دراز اور امیدو، بیم کا ہنگامہ گھر کو بچھلا دینے والا ہے۔ سوائے اس کے، کہ میں لہذا تماشاخی رہوں اور کیا کر سکتا ہوں! صدورِ حکم۔ برسمِ فرماںِ روا سے دینی (نامکمل)۔ اور اس حدالت کا بغیر صنعت کے ہونا، چوں کہ ظاہر ہے، بیان کی حاجت نہیں رکھتا۔ امید۔ کہ فرامس

\* یہاں اشارہ نواب محمد علی خان کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

ہاکنس بہادر، جو ہاروں حکام میں سے ایک با اختیار صاحبِ مرتبت شخص ہے، دہلی پہنچ گیا ہے اور اس نے عدالتِ دیوانی کو زینت بخشی ہے۔ یہ شکاریوں اور لالچوں کا گڑھ ہے، دلو خواہوں کی طرف توجہ نہیں دیتا اور سراسر آج کا کام گل پر لٹاتا رہتا ہے۔ واسے، اگر۔ دہلی پہنچا ہوتا، اس مضمون کے مصداق:

تا تو : من می رہی، ما (من؟) بہ خدا می رسم

[جب تک ٹو بھونک نہنے گا، میں خدا تک پہنچ جاؤں گا۔]

ہی کیا ہوتا۔ مجھے یہ خیال بھی آتا تھا کہ راستے۔۔۔ سے خود کو بنارس کی طرف ڈال دوں، تاکہ جب وہ اس سے آگے نہ بڑھیں تو میں بھی لن سے مل جاؤں اور اس کارواں کی گرو کی طرح (کچے کچے) رہوں اور دہلی نہ پہنچوں۔۔۔ محل کے گروہ پڑ گلوہ نے اس کی اہانت نہ دی۔ ناچار طوطا کو کہا وطن جا رہا ہوں، لیکن سنتِ افسردگی کے عالم میں آسمان اور (گھٹت کے) ستاروں سے جنگ کرتا ہوں۔ چٹاں چہ پختے کے دن، اس مہینے کی فوری تاریخ کو، راہِ بریا کے پیر سے بند کھول دیا جائے گا اور پیغامِ اجل نہ پہنچا تو اس ماہ کے آخر میں اس شہر میں پہنچ جاؤں گا۔

میرے بے خواہش مہینے میں وہ رہ کر ایک ہوس اہل رہی ہے۔ میں چل کر اہلِ کرم کے اخلاق کا محتاج اور بزرگوں کے الطاف کے دسترخوان کا ریزہ بنیں ہوں۔ اور کسی فقیر کو بھیک مانگنے میں مار نہیں آتی، میں (بھی) اپنی ہرزہ گوئی سے باز نہیں آؤں گا اور اپنی عرضِ جناب کی خدمت میں پہنچا تا ہوں۔

اے میرے فیضِ رساں، اگر ممکن ہو اور اس کی کوئی سہیل ہو سکے تو اس قوم (انگریز) کے عائدی میں سے کسی کا ایک سفارشی خط مجھ کا کسار کے بارے میں لے کر مسٹر فرانسس ہاکنس صاحب بہادر ریزہ پنڈت دہلی کے نام بھیج دیں۔ ہر چند کہ مرکزی دفتر کا حکم قبولِ فیصل کا درجہ رکھتا ہے، لیکن سفارشی خط سے مقصود یہ ہے کہ منصبِ عظمتِ شہار (جہاں) گم نام غالب انصاف کے حال پر توجہ دیں۔ اور یہ مقصد صرف دو طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ کوئی صاحبِ مشر ہاکنس بہادر کے دوست ہوں، اور یا اس کے ساتھ ساتھ آپ

کے دوستوں میں سے، یا آپ کے دوستوں کے دوستوں میں سے ہوں۔ مجھے یقین ہے، میرا عقیدہ راسخ اور امید قوی ہے کہ اگر ایسا ہوا تو آپ کے حادسوں سے ہرگز متاثر نہ رہوں گا۔ لیکن اس گراں مایہ تحریر کے حاصل ہو جانے کی صورت میں اس کا مجھ تک پہنچانے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ وہ باندہ، بندیل کھنڈ چینی جناب مولوی صاحب قبلہ و کعبہ حضرت مولوی محمد علی خان صاحب کی خدمت عالیہ میں پہنچے۔ خدا ان کے سامنے کو ہمیشہ قائم رکھے! وہاں سے مجھ تک آسانی سے پہنچ جائے گا۔ زیادہ جرنیل! (خدا کرے، آپ کی) بندہ پروری کا سونچ برتری کے افق سے ہمیشہ جلوہ گر رہے!

عرض داشت اسد اللہ

از مقام باندہ

مژدہ ششم جمادی الاول، بروز بدھ

\*\*\*

۲۹

۳۰

جو برہان گراں قدر اسے خاک پا سے حضرت قبلہ گاہی، ولی نعمی باو، مدظلہ العالی! یکم جمادی الثانی، بروز اتوار، (پچیسے) قیدی زندان میں، پتہ کتب میں، (اسی طرح) صاحب پریشاں حال وطن پہنچ گیا۔ کہیں یہ خیال نہ کیجیے گا کہ میری کوتاہ قلمی کم لکھائی کی وجہ سے ہے، بلکہ میں (در حقیقت) اس فکر میں تھا کہ کسل دور ہونے اور حواس درست ہونے کے بعد حرف و تحریر کی دولت حضرت قبلہ گاہی کے مدظلہ میں کی جہاں کے ہمدردوں پر پھیل کر جائے۔

سرکارِ عالی! دہلی کی عدالت کا تو یہ حال ہے کہ وہاں لوگوں کا دن بے دلائل کی آنکھ سے زیادہ سیاہ ہے، معزول حاکم گوشہ نگم نامی میں محکف ہے اور موجود حاکم بے پردہ اور

ڈاٹوٹول ہے۔ نہ اس (موزول حاکم) کا اختیار باقی ہے اور نہ اس (موجودہ حاکم) کو یقین یا اعتماد کا مل نصیب ہے۔ وہ (موزول حاکم) اپنے منصب کی بازیابی کا امیدوار ہے اور اس (موجودہ حاکم) کو دولتِ مال کے نزال کی سرعت سے پریشانی لاحق ہے۔ غرضے کہ جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے وہ خواص کی گھر میں ہے اور عوام کی زبان پر، ورنہ (حقیقت یہ ہے کہ) اس الجھے کا سیرا کسی کو نہیں مل رہا، مختصر یہ۔ کہ اس شخص کا حل کسی کے پاس نہیں ہے۔ مسطانیہ بالاک آدہ کا شرہ (البشرہ) دل بڑھاتا اور قسلی دیتا تھا (لیکن) اب بھٹنے میں آیا ہے۔ کہ اس کاٹلے کے ہر اہل دیکھتے کہ جو بنارس تک پہنچ چکا تھا، واپسی کا حکم ہو گیا ہے۔ سارے لوگ واپس ہو گئے اور پانچ تحت چلے گئے، اور کوچ۔۔ اگلے سال پر ملتی ہو گیا۔

میں جب یہاں پہنچا، بے سود ہر سمت دورٹنا پورا اور (افضل) حاکموں سے مل۔ ایک قصیدہ فرانسس ہاکنس کی خدمت میں پیش کیا، جو اس کی طبع نکتہ دہاں کو پسند آیا۔ (اس کے) مصاحبین نے مجھے بتایا کہ اس حاکم فریدوں ہاؤ نے آج تک امراسے دہلی میں سے کسی کی طرف توجہ نہیں دی اور نہ کسی سے میل جول کیا۔ یہ بات عکوف واقعہ بھی نہیں ہے، کیوں کہ پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے پورے ایک گھنٹے تک قصیدہ پڑھنے، گلشنے کی خبروں کی پوچھ گچھ، اور میری نالیش کے دائر کرنے کے متعلق بات چیت کے بعد شفقت ہوا۔ مختصر یہ کہ ہر عجم خود پیش سخن فہم ہے، کیا (جی) اچھا ہوتا، اگر تھوڑا (سا) معاملہ فہم اور ادانشاس بھی ہوتا۔ نہ معلوم، قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اپریل ۱۸۳۹ء میں میرے مقدسے کی رپورٹ دہلی سے مرکزی دفتر گئی اور اسی ماہ اس کا جواب بھی آ گیا، لیکن اتفاق سے مرکزی دفتر کے احکام کا پہنچنا، حاکم کی موزولی کا ہنگامہ اور دفتر کے شیرازے کے لوراق کی پریشانی، یہ سب (واقعات) ایک ہی دھت میں عکس پذیر ہوئے۔ اس پر اگندگی میں میری بد قسمتی نے خاص طور پر اسی صفحے کو، جس پر غالب سیاہ روز کی کام یابی کا نقش بنا تھا، بے نام و نشان کر دیا۔ دفتر کے اراکین نے مسند کے حکم پر فائلیں چھان ماریں اور ورق ورق پلٹ ڈالا، لیکن وہ کاغذ نہ مٹا تھا اور نہ مل۔ دہلی ریڈیکسی کے سیکرٹری صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ ہم نے اس صفحے کے بارے میں مرکز کو لکھا ہے اور اس حکم کا ملٹی طلب کیا ہے۔ تاکہ وقت پر کام

جائے اور کھوئی ہوئی ہجیر مل جائے۔

یہ ہے کہ غالب شوریہ، نخت کی پریشانیوں کا خلاصہ، جو میں نے اس خط کے دامن میں رگِ جان سے قرار کیا ہے۔ پہلی بجلی، جو پہنچنے کے ساتھ ہی میری نظر پر گری، وہ بھائی کی، خدا اسے سلامت رکھے، قسمت و برخواست کی روش کا مشاہدہ تھا کہ بیماری کی شدت کے سبب پڑیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا اور اس کے جسم کے خون کا ہر قطرہ و سوداوست کی انتہا سے فقط سیاہ ہو گیا تھا۔ جس حال کو بے عقل لوگ درست خیال کر رہے تھے، ہرگز افادہ نہیں تھا (بلکہ) وہ بھی فتویٰ جنون کا ایک رنگ تھا۔ فرمئے کہ جس طرح میں اپنے پچھلے خط میں کلمہ چکا ہوں، میں یہ سوچتا تھا کہ اگر یہ حال راقل ہو جائے اور مرض صحت میں تبدیل ہو جائے (تو) کیسا عجوبہ ہوگا، لیکن اب تو مریض کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ طبیعت شفا کو قبول نہیں کر رہی، (چنانچہ) میں اپنی آنکھوں کے ذریعے یقین کی اس منزل پر پہنچا ہوں کہ میرزا یوسف ناخبات ہمیشہ بیماری رہے گا، اور بس!

مزید یہ کہ وہ وصال، جو راہِ گزرا اندیشہ سے اشا (ہے)، حکام کی بد نظمی کے پٹا سے کی گئی تھی کا مشاہدہ ہے، جیسا کہ خط میں تحریر کیا گیا۔ الموس ہے اپنے حال پر کہ قسمت نے مجھے ایران کی خوش گوار آب و ہوا کے شہروں میں نہ پہنچایا۔ ہاں، وہ یزد کے آتش کدے۔ اور شیراز کے شراب خانے۔ مانے لوتا ہوں کہ میں اس بیمارستان میں نہیں پہنچا، (تاہم) جنت البقیع بھلا کیا کلم تھی کہ۔ مجھے اس حاذر میں لے آئی۔ اس سرد زمینی جنت میں آرام کیا (ناکمل)۔ اللہ، قدّ قائلہ

غالب جو زوالمہ بدر جستم من  
آفر زہ بودہ امی چہیں بر گشتن  
باید کہ کنم ہزار طریں بر خوش  
لہ (یہ زبان) جادۂ راہ وطن

(غالب، جب میں حال سے نکل گیا تھا (قر) اس واپسی کا بھوکا کیا سبب۔ یہ ۹۰ بجے ہاں ہے)

کہ میں خود پہ ہزار طعریں کروں، لیکن جاوہرِ رابع وطن کی زبان سے۔

قبلہ گاہا! کثرتِ آشوب پریشانی کے سبب چوں کہ میں ابھی تک کوئی خط نواب  
ہمایوں القاب اور دوسرے احباب کی خدمت میں نہیں لکھ سکا، (اس لیے) امید کرتا ہوں کہ  
اس خط کے ورود کو کسی پر ظاہر نہ کریں تاکہ (دوسرے احباب) مجھے شکایت کے گھنٹے میں نہ  
کسکیں۔ زیادہ عذرِ نواب۔ تمام عزیزوں کو موجبِ ہنسی۔

معروضہ پندرہ جمادی الثانی ۱۱۳۵ ہجری

\*\*\*

۳۰  
—  
۱۱

حضرت قبلہ گاہی، دلی نسلی، مدظلہ العالی!

چوں کہ آدابِ نیاز کی ادائیگی کے معائنہ اور مراسمِ تسلیم کی تھوڑی سی ناسرگاریِ نمانہ  
کے کثرتِ استعمال سے کالی فرسودہ ہو چکے ہیں اور میرا شوق اس معیارِ خدمت پر خوش نہیں  
ہوتا، ہر حال میں آپ کے سر پر بخار ہوتا ہوں اور اپنی جان آپ کے قدموں کی خاک پر بھروسہ  
کرتا ہوں، (ارہے) دوسرے کام، سو وہ آسمانِ واجہم کے خالق کے ہاتھ میں ہیں اور اختیار کی  
ڈور کا سرا عہدِ دست کے پیچ میں گھوم گیا ہے۔ ہارِ جندی، پیر کے دلی دلی کے فرماں روا کے  
مکتوب نے، جو فیروز پور کے جاگیردار کے نام تھا، روانی کے پر کھولے۔ چوں کہ مکتوب الیہ  
اس شہر (یعنی دلی) میں تھا، خط بے وقت، ہنسنا۔ خدا کی نگر ہے کہ گفتیش کا دروازہ (حق) کھلے۔  
منفعت کی فکر کا خلاصہ اسی کے الفاظِ بیخِ پیش کیا جاتا ہے، اور وہ یہ ہیں:

چوں کہ محمد اسد اللہ خان کے دعوے کے مقدمے کی تحقیقات کا حکم  
صدر دفتر سے ہنسنا ہے، خالی مذکور کی عرضی کی نقل اس خط کے ساتھ



منک ہو کر قلم منت رقم کے سپرد کی جاتی ہے، تاکہ اس کے  
مضمون کے معنی کو سمجھ کر اس کا مفصل جواب دیا جائے۔ فقط۔

بے شک چاروں صد دفتر کے احکام کے اجرا پر ریڈنسی سے کوئی عمل نہیں ہوا،  
تاہم حاکم دہلی اس جگہ سے میں (بطور خاص) کسی کے کام کی پائیداری اور درستی کا روالہ  
نہیں، اور نہ ہی مدعا علیہ کے لیے رعایت (دیکھتا ہے)، کہ اس فریدون کی سی شان و شوکت  
رکھنے والے حاکم کی عظمت میں کسی کی جانب داری یا طاقت پائی ہی نہیں جاتی۔

لہذا حسی اتفاق یہ ہے کہ دفتر کے کارکنوں میں سے بھی کوئی میرا شناسا نہیں۔  
دفتر خانے کی بنیاد سے واپسی کا احوال اور اس صنفِ اعلیٰ کے، جو میرا شناسا ہے، قرعہ  
مرح رواں کی آئندہ سال پر جا پڑتا، مجھے جیسے انسان کے لیے اس کا اظہار ضروری نہیں ہے۔  
فرمے کہ جناب ولی نعمی کے خط کے نہ پہنچنے سے میرا غم مد سے سوا ہو گیا ہے۔ امید کرنا  
ہوں کہ ان دو مہینوں میں آں جناب کی طرف سے پروانہ بھالی پہنچی جائے گا اور مجھے اس  
کش مکش سے نجات دلا دے گا۔

وہ قصیدہ، جو جنابِ ناظم الملک مسٹر فرانسس ہارکس بہادر بہت جنگ کے خدام کی  
مدد میں اس نوکِ قلم سے تصنیف کیا گیا ہے، تحریر کیا جاتا ہے:

یافت آئینہ بہتِ قو ز دولت ہوا

جلوہ ہا ساز کن سے دلی و برخودیش بنا

گل برافشاں بہ کہہاں چو حریفِ سرست

جلوہ گر شو بہ نظر بہد عروسی طہار

وقتِ آفت کہ پائیز قو گوو نودوز

وقتِ آفت کز انہام قو بالہ آغاز

- جوشِ آبِنگِ ہرز است ترا بانگِ سرور  
 موجِ نیرنگِ بہار است ترا رشتہ ساز  
 سیرگاہی ست در اطرافِ تو گوئی کشیر  
 ۵ روستائی ست ز اقصائی تو گوئی شیراز  
 گدو سرگودہ است آں جہد کہ گدوہ ٹٹ  
 خاطر آویز تر از طرۂ مشکبیا لیاذ  
 چشم بد دور کہ ہر جاوہ بہ سراے تو گشت  
 ہچہ گدوہ نقشِ قدمِ شاہِ ناز  
 فرصتِ باو کہ آرائشِ ایوانِ تو شد  
 دلورِ عادلِ عالم کشِ مظلوم نواز  
 - برخیزاں ہمیں کوئے او  
 بستہ بر دامنِ نظارہ ز فروس (طراز)  
 آں کہ بر خاکِ درش چرخِ چہ عرضِ سہو  
 ۱۰ شب و روز از سر و خود شید بود ناصیہ ساز  
 آں کہ در ہند بہ سنجی اثرِ سدِ نقش  
 آشیانِ ساختہ کنبک ز سر پنہ باز  
 آں کہ باشد بہ یہ فیضِ درِ مکرِ نقش  
 چوں در آئینہ پیوستہ بہ ٹوے ہمہ باز  
 بہ سلاش ز خمیدہ است ز صد جا، گر چرخ  
 از چہ شد دائرہ بر دائرہ مانند پیاہ

نم یک رخت فیض است کہ تارخت فرد  
 در دوش راسے شد و بر لب صحنی اہواز  
 استقامت نالش بہ زمیں بکے ز صل  
 سایہ بر شخص نہ جمید بہ پہنا و دراز  
 ۱۵ بکے دل محنت ز فیض اثر تربیتش  
 شیشہ را نیست بہ ہنگام گلشن آواز  
 عزم وے در روشی مریدہ با جہنم سیم  
 راسے وے در اثر جلوہ بہ خورشید انہاز  
 بر رخ از تاب رخس فر سلاوت پیدا  
 در رہ از گرد رہش خلی ہما در پرواز  
 اسے کہ برنامہ نام تو ز دیوان قصا  
 بستہ اند از اثر دولت جاوید طراز  
 ای رقم ہا کہ فردہ رختہ ام از رگ گلک  
 ۲۰ ہاشہ آرائش قریب پئے مرضی نیاز  
 در نہ اندازہ ہر بے سرو پاسے نہ بود  
 کہ بہ اندازِ ثنائے تو نماید نگ و تاز  
 بندہ ام لیک ددی مرحلہ مصالحو تو ام  
 کردہ ام طے بہ امید تو رہ دور و دراز  
 مگر نہ آوازہ عدلت وے آہنگِ عدی  
 ناقد من ز رہ سہی نہ گدیدے باز

نالہ زارِ من از شدتِ جورِ مہرکاست  
 نہ ز دیوانگی و خیرگی و شوقی و آرز  
 بر دستِ من یہ رزق کہ کشاید داور  
 ۲۵ حیف باشد کہ کند خضم ہاندیشِ فراز  
 بہت سال است کہ ہایک و گر آہنخہ ایم  
 من و عاصب جو سرِ رشتہ شمع و دم گہز  
 او ز خونخواریِ خویش در اندازِ غضب  
 من ز بے ہارگیِ خویش در آدابِ نیاز  
 آہ از مریدہ پردازیِ بہتِ سرکش  
 داور از خانہ براندازیِ چرخِ گج باز

تیسری قسمت کے آئینے کو اقبال سے آرائش ملی ہے۔ اسے دہلی، اپنے جلوے کو  
 روشن کر اور اپنے لوہے پر فکر۔

ایک دل پر سرمست کی طرح لگے ہیں پھول ڈال اور ایک عروسِ مظاہر کی طرح نظر کے  
 سامنے جلوہ گر ہو۔

اب وہ وقت ہے کہ تیری خزاں نوروز میں بدل جائے۔ اب وہ وقت ہے کہ آواز  
 تیرے انہام سے پھوٹے۔

تیرے لیے سرود کی آواز جوشِ آپہنگِ ہزار کی مثال ہے، (اسی طرح) تیرے لیے  
 رشتہ سازِ مسیحِ نیرنگِ بہار کے مصداق ہے۔

کشمیر تو گویا تیرے مصافحات کی ایک سیر گاہ کی طرح ہے اور شیراز تیرے دورِ المختارہ  
 ملائقوں کا ایک گاؤں ہے۔

میں تیرے سر پر سے قربان ہو جاؤں، اس جگہ کی گرد جو تیرے راستے کے اطراف

میں ہے، اپلاز کی رشتہ منگیوں سے زیادہ دل آویز ہے۔  
چشم بد دور کہ تیرے سمرائیں ہر جلوہ شاہدِ ناز کے نقشِ دم کے گلِ دہشت کی صورت  
ہو گیا ہے۔

(اے دہلی)، خدا تجھے سلطنت رکھے کہ ایک (ایسا) منصف، جو عادل، غلام کش اور  
مظلوم نواز ہے تیرے ایوان کی زینت بن گیا۔

... جس کے کوچے کے چمن کے خیال نے واسیِ ظاہر پر جنتِ سہادی ہے۔  
وہ جس کے دروازے کی خاک پر آسمانِ تھرم سجدہ کے لیے راتِ دلِ جاندا اور سورج  
کے دھبے پشائی بن جاتا ہے۔

وہ کہ ہندوستان میں اس کی انصاف پسندی کی برکت سے چٹیا نے باز کے بننے سے  
اپنا گھوٹو بنایا ہے۔

وہ کہ فیضِ رسانی کی خاطر اس کی بخشش کا دروازہ ہوشِ اور ہر ایک کے لیے درِ آئینہ کی  
طرح کھل رہا ہے۔

اگر آسمان سوچے سے اس کے سلام کے لیے نہیں جھکا تو چہاڑ کی مانند دائرے پر دائرہ  
کیوں ہو گیا ہے؟

اس کے ایک رشتہ فیض کی نفی ہے کہ جب ٹہنی تو اس کے دل میں راسے ہو گئی اور  
صحنی کے لب پر سبز۔

اس کے عہد میں زمین نے انتہائے عدل سے ایسی برابری حاصل کر لی ہے کہ کسی  
شخص پر سایہ نہ چھڑائی میں اور نہ (ہی) لہائی میں غالب ہوا۔

اس کی تربیت کے اثر کے فیض (کی انتہا) سے (خوش) دل ہو گیا، (چنانچہ اب)  
چیشے کے ٹوٹے وقت آواز نہیں آتی۔

اس کا لہو جنگ کے معاملے میں آسمان کا شریک ہے اور اس کی راسے اثرِ جلوہ میں  
سورج کی سا بھی ہے۔

ہرے ہرے، اس کے ہرے کی جانب ناک سے، سادت کی شان آشکارا ہے (اور) اس کے راحقے کی گرد سے راحقے میں (گویا) ہڈاؤں کی ڈار اڑ رہی ہے۔

اسے وہ ذات، کہ تیرے نام کے خط پر دیوالیہ قضا سے دولتِ ہلید کے اثر کے نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔

یہ ساری تحریر، جو میں نے کوکِ ہلم سے لکھی ہے، کیا (ہی) اچھا ہوا اگر عرضِ نیاز کی قریب کی زینت بن جائے۔

ورنہ ہر بے سرو پا آدمی میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ تیری تعریف کے اظہار میں لگ و دو کرے۔

(یوں تو) میں ایک غلام ہوں، تاہم اس مرحلے پر میں تیرا ہمسایہ ہوں، تیری (ہی) امید پر میں نے دور دور کا (چرا) راستہ طے کیا ہے۔

اگر تیرے بدل کی شہرتِ خدی کی آواز نہ بن جاتی تو میرا نانا سنی کے راحقے سے واپس نہ ہوتا۔

میرا نانا راکھ کا کے ظلم کی شدت کی وجہ سے ہے، (یہ) دیوانگی، حماقت، فحاشی اور حرص کی وجہ سے نہیں۔

اُس رزق کو جو دلوں میں سے لوہے کھوٹا ہے، اٹھوس ہوگا، اگر بداندیش و شمنی بند کر دے۔

بیس سال سے میں اور غاصب ایک دوسرے سے (یوں) دست و گریباں ہیں جس طرح شمع کی شئی اور گھنٹی۔

وہ اپنی خوں خواری کی وجہ سے غضب ناک ہے اور میں اپنی بے بسی کی وجہ سے حالتِ نیازمندی میں ہوں۔

(اپنے) سرکشِ بنت کی عریہ و جُوبی پر (مجھے) اٹھوس (ہوتا ہے، اور میں) آسمانی کج باز کی طمانہ براندازی سے انصاف (انگھتا ہوں)۔ [۱]

اس رکھے کی نکل جو جناب محمد اسد اللہ خان صاحب عرف مرزا نوشہ  
نے جناب نواب سید علی اکبر خان بہادر طہاٹھانی کو آسم کی فرمائش  
کے لیے سپردِ قلمِ ندرت رقم کیا تھا، اور وہ یہ ہے:

قبلہ مکانِ آفاق، (خدا آپ کو) سلامت (رکھے)!

ممدوحِ توصیف سے بے نیاز ہے اور واصفِ اظہار میں ناکام۔ عرضِ نیاز میں خلہ  
بے کار ہے اور اظہارِ شوق میں نگرارِ بری گشتی ہے، سو کیا کیا جانے کہ خوشی کی آبیرو نہ جانے،  
اور کیا لکھا جانے کہ کوتاہِ قلبی کا داغ مٹ جانے۔ بے شک یہ عبودیتِ نامہِ سلامِ روستائی کا  
انداز اور اس کے ہر حرف کا دائرہ کارِ گردانی کا نقش رکھتا ہے۔ کچھ تو میں بیٹ کا غلام ہوں  
اور کچھ نہ توں، (چناں چہ) مجھے آرائشِ خوان کی بھی ضرورت ہے اور آرائشِ جاں کی بھی۔ اور  
لہ باسِ دانش جانتے ہیں کہ یہ دونوں صفات آسم میں موجود ہیں۔ اور گلشنِ والوں کا یہ کہنا ہے  
کہ آسموں کا ملک پہلی بندر ہے۔ کیوں نہ ہو، آسم پہلی سے اور ہمول گشتی سے، سخاوت  
جنابِ عالی سے اور نگر گزاری مجھ سے! میرا شوق یہ سوچتا ہے کہ ہر طورِ احتیاجِ فصلِ تک  
دو عین ہار تو نہ لونڈِ لغت کی خاطر اقدس میں گزروں، لیکن حرصِ روتی ہے کہ اس قدر تشنگی سے  
میں خوش نہیں ہوں گی۔

گلویم گشت (وہ جان و دلمِ افسردہ اسے سائی)

بدہ نوشینہ دارو سے کہ ہم آتش، ہم آپ استی

[اے سائی، میرے گلے میں پیاس (ہے) اور میری جان اور دل افسردہ (ہیں) مجھے وہ

خوش مزہ دارو سے جو آگ بھی ہے اور پانی بھی۔]

آپ کا غلی مرادِ ہارود بھی رہے اور سایہ گستر بھی۔ وہ (ہارودی کے سبب) دالانِ لگاؤ

میں شرافشاں رہے اور یہ (سایہ گستری کے باعث) درویشوں کے سروں کا بھی خواہ!

ضمائم از مرتب





## ضمیمہ: ۱

یہ امر قطعی نہ رہے کہ جب محمد غالب خاکسار کا ستارہ بد بختی گلش پہننا تو ستم گر لای وطن میں سے ایک بد طوئت تھے، جو محمد سے پیش تر ہی اس جنگ... (قیاسی و موجود تھا) اور جو ارکانِ عدالت سے شناسائی کا دم بھرتا تھا، یہ مشہور کر دیا کہ اس رہنمائی سے، کہ ایسی دہلی سے وارو ہوا ہے، نہ صرف اپنا نام، بلکہ تقصیر بھی بدل ڈالا ہے، (جہاں چہ) صاحبانِ بارگاہ کو دفترِ کدے کے حاکم کے سامنے اس بے حیثیت کا نام پیش کرنے میں تامل ہوا۔ ناچار میں نے اپنا اردو غزل کا دیوان، جس کی تالیف کو سات سال سے بھی زیادہ ہو چکے تھے اور جس پر اس رؤساء کی سرور میں سے ایک مہر تھی، سید اطہر خان عرف مرزا نوشہ "تبع ۱۳۳۱ ہجری" جس کے زبیب دامن و آستین تھا، اور اس صفحے کے اختتام پر دشمنوں کی زباں بندی کی آخری تحریر بھی موجود تھی، دفترِ کدے کے حاکم اسلحہ کے پاس بطور شہادت بھجوا دیا اور اپنے بیٹے کی جلیں کو غماص کے نیچے (مراد: قلم) کی ٹوک کی مدد سے کاغذ پر اس طرح ظاہر کیا:

قبضہ نسبی ستم رسید گاں، (خدا آپ کو) سلامت (رکھے)!

الترجم شیعہ جان لسانی کے اقلہ کے بعد یہ عرض ہے کہ ہر چند وہ گفت گو، جو میرے نام اور حریت کے اختلاف کے بارے میں پھڑ گئی ہے، اس جنگِ آفرینش کے لیے ذلت کا سبب ہوگی، تاہم کیا کیا جانے کہ قیامت پر قیامت پیش آرہی ہے اور کھولتی ہی کھولتی کا سبب ہی رہی ہے۔ سبحان اللہ! میں، جو دو سو فرسنگ سے سکول کی دھار پر سینہ رکھتا اور فرکا کی سلطنت کے ستم سے گر پڑے و زاری کرتا ہوا، اس عدالت میں پہنچوں اور یہاں سے بھی گلے میں لعنت کا طوق لے کر اور دامن میں طاعت کے پتھر بھر کر لے جاؤں، تاکہ میرے

بعد اس شہر کے خواص مذات تک ایک دوسرے سے پہنچا کریں کہ  
قلیل دور میں ایک بھول الاموال اجنبی اس سواوا عظیم میں وارد ہوا تھا اور  
وہ ہر سال اپنا ایک نیا قفس رکھ لیتا تھا اور ہر پچھنے اور ہر پختے اپنا  
ایک نیا نام اور اسم جدید اختیار کر لیتا تھا۔ واللہ بصیر بالعباد۔ \*

خاتم کا وہ نقش، جو دوسرے دکان کے اختتام پر (سیری) ان اور اقی  
پریشانی کی پرانی غزلوں کے مطلع میں ہے، دیکھنے کے لائق اور سزاوار  
مشاہدہ ہے۔ بے شک، وہ ہر بھی اس ہٹا سے کے لیے لوح و جہتیں  
ہے اور اس بحث میں تیجہ دوم کا حکم رکھتی ہے۔ چوں کہ جس طرح وہ  
نیا نام رکھ لینے کے دعوے کی تکذیب میں مذنی کا منہ بند کر دیتی  
ہے، (اسی طرح) میرے اصلی نام کے تسلیم نہ کرنے میں مجھ گم نام  
کے سکوت کے لیے بھی کافی ہے۔ جیوناً اس حقیر کا نام اسد اللہ خان  
ہے اور عرفیت مرزا نوشہ اور قفس غالب، لیکن "غالب" چوں کہ  
چار حرفی لفظ ہے اور بعض ہموں میں وزن میں نہیں آتا، (اس لیے)  
حقیر لفظ "اسد" کو جو گناہ گار کے نام کا منقذ اور ساتھ ہی سہ حرفی لفظ  
ہے، کبھی کبھی بطور قفس استعمال کرتا ہے۔ اگر یہ غلطی ہے تو  
معاذ کی جائے اور اگر جائز ہے تو اوصاف کیا جائے۔ ہر حال، میں  
اسید رکھتا ہوں کہ تبدیلی نام کی ذلت کا داغ دامنِ حال سے دھو ڈالیں  
اور اس کے بعد جو ہائیں، کہیں۔ مجھے جس نام سے بھی پکاریں، میں  
سر کے بل دوڑتا حاضر ہوں اور مجھ پر جو لطف بھی فرمائیں (میں)  
ہر طور (ہاں نظاری (ہی) کروں گا۔ اللہ بس، باقی ہوس!

میرزا نوشہ

عرف

اسد اللہ خان

\*\*\*

\* اللہ اپنے بندوں کو دیکھتا ہے۔

## ضمیمہ: ۲

ہمکنی ہوئی بلیوں جیسے القاب کے مالک!

یہ امر پوشیدہ نہ رہے کہ جب میں نگلنے پہنچا تو لوگوں کے گودہ کے گودہ میرے چپکے پڑ گئے اور انھوں نے نکتہ چینی اور شرفا آزادی شروع کر دی، بلکہ انھوں نے ایک ٹولہ خاص طور پر (مجھے) پریشان کرنے کے لیے ترتیب دیا اور وہ آپس میں مل بیٹھے صرف اس لیے کہ میری خاصیت پر اٹھ کھڑے ہوں۔ وہ ہر طرف سے آ کر جمع ہوتے اور انھوں نے اس محل کا نام مشاعرہ رکھا اور اس محل کی ابتدا کر کے بعد پر احسان کیا۔ دوسری صبت میں حکیم بہام کی منزل کے مطلع کی زمین (مشاعرے کے لیے) مصرع طرح شہری اور وہ (مطلق) یہ ہے:

در میاں مں و دلدل بہام است مہاب

دارم امید کہ آن ہم ز میاں برخیزد

دس بارہ اشعار میں نے بھی اسی رویت کا لیے ہیں رگی گنگ سے ٹپکانے اور مشاعرے میں پڑھے۔ ایک جفتے کے بعد یہ اطلاع ملی کہ کسی جلسہ عقوف نے ان اشعار میں سے ایک شعر پر نکتہ چینی کر کے خود کو ادب باہ ذوق کی نظر میں رسوا کیا ہے۔ شعر یہ ہے:

جزو سے از عالم و از ہر عالم بیشم

بہم شوسے کہ جلی را ز میاں برخیزد

اعتراض یہ ہے کہ "عالم" کلمہ سفر ہے، اس کے ساتھ لفظ "ہم" کی ترکیب درست نہیں ہے اور وہ اس وجہ سے کہ عالم بذات خود مجموعہ اشیا ہے اور "جماد شربت" اور "نہر القصاصت" میں اس (ترکیب) کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ لفظ "یش" ، تاوقتیکہ اس کے بعد "تر" نہ لائیں، استعمال نہیں ہوتا۔ چنانچہ مناسب

نہیں ہے کہ اس کو (تسا) لکھا جائے "پیش تر بھننا چاہیے، "پیش" تسنا نہیں کہا جاسکتا۔ مزید یہ کہ محقق کی کمر پر ہالوں کا آگنا حقاً اور مادّاً۔ (قیاسی، محال ہے)، دیگر یہ کہ ہالوں کے یا سبزے کے اگنے کو "برعاستی" نہیں کہا جاسکتا۔

فرمے کہ جب میں نے ان اعتراضات پر نظر ڈالی اور مترض کی طبعی حیثیت کو جاننا۔ (قیاسی،) تو مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس بلا نق کے مزگنا) اور اس سے گفت گو کی رحمت اٹھانا سیرے لیے جائز نہیں، لیکن چوں کہ حق کی حمایت کرنا اور حق کے لیے جنگ کرنا ہر ایک (مقتضی) کے لیے فطری امر ہے، مجھے بھی ہر در سے غرض آگیا اور میں (مشارعے کی) تیسری قسمت میں ان اعتراضات کا جواب دینے پر آمادہ ہو گیا۔ قدرت نے اپنا انتظام (پچھلے سے) کر رکھا تھا اور حق اہل حق کی حمایت کے لیے بڑے اچھے انداز میں ظاہر ہوا، یعنی ان دنوں میں حاصل ہونے والے علم میں سے ایک مستقر شخص، جو سعادت پر ایران سے آیا ہوا تھا، ہانہاں مشاعرہ کی دعوت پر اس محل میں موجود تھا۔ اس نے ان سب لوگوں کے اشعار سنے اور جب میری ہادی آئی تو بلا جود ہم محاف کے اس کی ماری تو بڑھ میری طرف ہو گئی اور اس نے میرے لیے اپنے تحقیقی کا اعلان کیا۔

شاہد ان ایرانیوں نے، جو اس سے پیش تر گلشن میں تھے، اس کے سامنے میری نغز گوئی کی تعریف کی ہو۔ جب اس نے میرا کلام سنا اور اسے میرا قصص معلوم ہوا، سمجھنے لگا، تیرے کلام میں بہت زور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو سب لوگوں پر غالب ہے اور اسم بامسمیٰ ہے۔ یہ سمجھ کر اس نے اہل برسم کی طرف رخ کیا اور کہا، دو ستو تم لوگوں کے درمیان ہے۔ پس گد اختر اور خونیں نوا قنیت ہے۔ اس شخص کی ہر کہ کو کہ شرف و داعی سے علیٰ نظر یہ (شخص) ہادی زبان کا عالم (بھی) ہے۔

یہ گفت گو کرتے ہوئے میرے قلم کا گھوڑا بدکا اور اس نے میدان حق جوتی میں قلعے کی گواڑا دی۔ میں نے جب اعتراضات کا جواب دینے کو زبان کھولی تو سفیر بدکا اور میرا ہم زبان ہو گیا اور اس نے میری توصیف کرنا اور ان لوگوں پر ہنسنا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ چند اشعار اسامند، جو میں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے تھے، اب بھی مجھے یاد

ہیں۔ ان اشعار میں سے ایک شعر حافظ علیہ الرحمہ کا ہے، جو لفظ "ہم" اور "عالم" کی ترکیب کی نشان دہی کرتا ہے:

گر میں آلودہ دامنم ہر جب

ہم عالم گویا صحتِ دوست

دوسرے ایک مطلع ہے مصطفیٰ الدینی سودی علیہ الرحمہ کا:

ہر جہاں خرم از آئینم کہ جہاں خرم از دست

ماستم ہر جہاں عالم کہ ہر عالم از دست

ایک اور شعر حضرت نور الدین جامی علیہ الرحمہ والفرقان کا ہے جو مکمل طور پر، بغیر

"تر" کے، لفظ "بیش" کے استعمال کا جواز ہے:

کم از آئینم کہ در معذرتم باید زد

بیش از آئی کہ وہی بختِ قصیر مرا

ایک اور شعر بھی (کسی) اسطو کا ہے، جو "برعاستی" اور "زودیدن" کے ہم معنی

ہونے کے اثبات میں ہے، جہاں ہر شاعر کہتا ہے:

از دست، خطِ مشکِ سودِ برعاست

آتشِ بہرِ قست و دورِ برعاست

قصہ مختصر، محلِ اختتام کو پہنچی اور ہر شخص اپنے اپنے گھر چلا گیا۔ اس مکان میں جو

لوگ موجود تھے، کیا شاعر اور کیا غیر شاعر، سب نے شوقاںانہ طور پر شریعتِ میری سے عفت

ہٹا کر آئے اور انہیں میری کلکت میں اپنی فضیلت نظر آئی اور وہ میری غزل کا

ایک شعر لے بیٹھے اور نکتہ چینی اور نااضافی کی داد دینے لگے۔ شعر یہ ہے:

شودِ لکھے بہ قطارِ نیا مرغانِ دارم

طعنِ برے سر و سامانیِ طوفاںِ زندہ

پچھلے انھوں نے یہ مشورہ کر دیا کہ "زودہ" کے کسرہ کو مصناف الیہ کی ضرورت ہے۔ جب انھیں جواب ملا کہ "زودہ" میں کسرہ اضافی نہیں، بلکہ پائے وحدت ہے تو وہ دم بخود ہو گئے اور کہنے لگے، "زودہ" ہمیشہ مفعول میں آتا ہے، لیکن یہاں مفعول کے معنی میں نہیں آیا ہے۔ چوں کہ اس اعتراض کا جواب شنوی میں، جو اس کے بعد رقم کی جانے گی، برسی صرح و بطل کے ساتھ رقم کر دیا گیا ہے، اس لیے اس جگہ اس کا جواب لکھنا مفعول سمجھ کر اپنے مقصد کی راہ پر واپس آتا ہوں۔

اس جماعت میں سے ایک بزرگ قبیلہ و کعبہ نواب علی اکبر خان صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے گلہ کیا کہ اسد اللہ دہلوی، جو آپ کے نیاز مندوں میں سے ہے، مصلوں میں بد تعبیر کر رہا ہے اور پاس اوب بالکل طوعاً نہیں رکھتا۔ جگڑے میں زبان درازی اور طعنے میں پیش قدمی کر رہا ہے۔ مشاعرے میں اس نے ہم سب کو برا بھلا کہا ہے، مگر اسی مصل میں، جس کا ذکر میں لوہر کر چکا ہوں، میری زبان سے یہ نکلا تھا کہ اموس، کوئی صحیح قاطب اور کوئی مستند پارسى دان موجود نہیں کہ معترض کی قیمت کو جانچ سکتا اور معترض کی درخواست کی تہ کو پہنچ سکتا۔ ان ہی بزرگ نے، جو میری شہادت لے کر نواب علی اکبر خان بہادر کے پاس گئے تھے، اس درود مند بات کو خوب شک مریج کا کر پیش کیا اور میری طاعت مہرور کر دی۔

نواب علی اکبر خان نے مجھے نصیحت اور سرزنش کی اور کہا، اموس اسے قاطب، کیا تم یہاں سختی پھوڑی اور شر گوئی کے لیے آئے ہو؟ ہوشیار رہو کہ راستہ دشوار ہے اور وہ زان بہت۔

میں نے کہا، میں کیا کروں کہ سزاوار طاعت نہ ہوں۔

انھوں نے کہا، لہذا دھوا چھوڑو اور ساتھیوں سے مصالحت کر لو۔

میں نے کہا، چلیں، دھوا تو میں نے چھوڑ دیا، لیکن میں یہ نہیں سمجھتا کہ مصالحت کس طرح ہوگی۔

انھوں نے فرمایا، اٹھو اور جلد سے جلد معذرت کر لو تا کہ لوگوں کا دل تم سے نہ دکھے۔

میں نے کہا، معافی کے طریقے اور معذرت کی صورت کے بارے میں بھی فرما دیں

(کہ کس طرح ہوگی۔)

انہوں نے فرمایا، بطورِ جزا کچھ کھدو اور اس قرار کو میرے پاس بھیج دو کہ میں ان لوگوں کو دکھا دوں اور ان لوگوں کے دلوں سے رنگِ دل صاف کر دوں۔

چوں کہ یہ بات تیرے دل سے (کھن گئی) تھی، (میرے) دل میں اثر بھی گئی۔ میں نے ایک مثنوی لکھی اور "آشتی نامہ" اس کا نام رکھا اور تاجِ حسنِ بدِ ظنہِ امالی کی خدمت میں بھیج دی۔

اے تماشا نیالی	برمِ سخن	وے مسیحا	دلِ نادر
اے گراں نامہ عالم	حرف	خوش نشینانی	ایں بساطِ گلگرفت
اے سخن بہرِ دل	گلگشتہ	وے زباں	آوردانی
ہر یکے صدرِ برمِ باد گئے		شیخ خلوت	سراے کار گئے
ہر یکے پیشِ تازِ قافلہ		ہر یکے	کدخدے مرغلہ
اے ہر شعلی وکالتِ آمادہ		داؤ غم	خواری جہاں داوہ
اے گلگرفانی عالمِ انصاف		ہر سفارت	رسیدہ از اطراف
اے سخن را طرازِ جاں داوہ		صلو را	سایز گھستایں داوہ
عطر بر منیرِ گیتی افشانان		پہلوانانی	پہلوی دانان
اے گراہی فغانِ رہزنہ گو		نفر دہا	کشانی عریدہ جو
اے دیکھانی ایں سولہ عظیم		وے فراہم	دہ ز بہتِ اقلیم
ہمو منی آرمیدہ ایں شہر		ہر کارے	رسیدہ ایں شہر
اسدِ لطف بہت بر گشتہ		دہ غم و	پیچِ جز سر گشتہ
گرچہ ناخواندہ میمانی شامت		بے سخن	دینہ بخوانی خوالی شامت
ہر عظم رسیدہ است ایں جا		ہر امید	آرمیدہ است ایں جا



آرمیدان دید روزے ہار  
 میہاں را فزاشن رسم است  
 آل ہر رسم کارسادی کو  
 کیستم؟ دل نکشت غم زدہ  
 برقی بے تائی بہاں زدہ  
 از گداز نفس بہ تاب و تہی  
 خس طوفانی میط بط  
 دروندے، جگر گداختہ  
 در آغوش فنا زدہ  
 چہ بلہا کشیدہ ام آخر  
 ہ سیر روز غریتم بینید  
 اندوہ دوری وطن نگریہ  
 نہ ہمیں نالہ و فغان بہ لبم  
 سوہ چہاں سوے کردہ است مرا  
 فوق شعر و سنی کلاست مرا  
 اندوہ خویش کردہ زار مرا  
 دارم آرسے ز ہرزہ لائی خویش  
 گردش روزگار خویشتم  
 با من ای ختم و شکم، درخ درخ  
 ہ غریہاں کا روست ستم  
 ہر بگویند باجرے رفت

خستہ را بہ سایہ دیوار  
 کھر کو نیک ساختن رسم است  
 شبوہ میہاں نوازی کو  
 بے دلے، خستہ ستم زدہ  
 آتش غم بہ خان و ماں زدہ ۳۰  
 در بیابانی یاں خستہ لبی  
 سر بسر گرد کاروانی فنا  
 از غم دہر زہرہ باخستہ  
 ہر ہر خویش پشت پا زدہ  
 کہ بدی جا رسیدہ ام آخر ۳۵  
 تیرہ شب ہاسے و ختم بینید  
 غم ہجران انہی نگریہ  
 من و جان آفری کہ جاں بہ لبم  
 طستہ پدخوے کردہ است مرا  
 کی زبان سخی سراسر مرا ۳۰  
 با سخی پردوی چہ کار مرا  
 نوہ ہر خویش و بے نوائی خویش  
 حیرت کاروبار خویشتم  
 من چنیں، تا چہاں، درخ درخ  
 رسم گر نیت خود جرات ستم ۳۵  
 از تو در گنگو خلاے رفت

مهربانان خداے را الصاف  
 نمک اندر سبویے سے کہ گفند؟  
 رخصت گفتار را کہ در ہم کرد؟  
 "ہمس عالم، غلط" کہ گفت نخست؟  
 "بیش" را "بیش تر" کہ گفت؟ کہ گفت؟  
 سوے را بر کمر کہ گفت غلط؟  
 چہل بدیدید کا اعتراض خطاست  
 رشتہ باز بدی تاب کہ داد؟  
 چہل بدیدید بی گناہی می  
 ہر کہ دیدم رو خوشی رفت  
 از ہر بود آں ہر عرصہ دم نہ زدن  
 نہ کشودن لیے بہادیم  
 از غم دل ستودہ گویدم  
 گلہ مندانہ گفتگو دارم  
 چہل شنیدم کہ کتہ پودانان  
 از من آرزودہ اند زان پاشخ  
 غفلت آوردم و جنوں کروم  
 آب گویدم و چکیدم می  
 نفسی می ہر جمع در گرفت  
 روے دھوی ہر سویم آوردند  
 داغ گشتم از آں طاست ہا

تا نخست از کہ بود رسم طاعت  
 ہر بھی رستخیز دے کہ گفند؟  
 بر ہم اشعار را کہ در ہم کرد؟  
 پارہ زان نط کہ گفت نخست؟ ۳۰  
 بد ز من بیش تر کہ گفت؟ کہ گفت؟  
 شعر را سر بسر کہ گفت غلط؟  
 آنچہ غالب نوشتہ است بہاست  
 مسترض را ز من جواب کہ داد؟  
 تا نہ شستہ رُوسپائی می ۳۵  
 بود لادم بریں گرفت گرفت  
 در رو آہمی ہم نہ زدن  
 خیرہ بگذاشتن ہر داوریم  
 ہر ہا یک گوہ گویدم  
 پارہ در سخی غلو دارم ۵۰  
 ہر دوانان و انہی سازان  
 ہر نیاقش ہر خاک سودم رُخ  
 خرویشتی آب، و دیدہ غول کروم  
 قطرہ آسا ہر سر دودیم می  
 کس نیازم ہر بچہ بر گرفت ۵۵  
 سخی می برویم آوردند  
 سوختم از نصِ نداشت ہا

نہ امیدم ز طامری ست نہ بیم  
کاش، ہا اعتراض ساخته  
نُسخِ دعوی نہ بدلوختے  
زانکہ آں ہم رمناسے یاروں بود  
خارِ دلانی دوستوں بودن  
دیگرم ہا ہرگز رنگِ خروش  
کہ دگر پُلیٹے صغیر زوہ است  
پاوجودے کہ شعرِ من صاف است  
اعتراض آتھم بہ جاں زوہ است  
"زوہ" را کسرہ از غرات نیست  
واضح طرزِ ایں زبانی نہ منم  
دیگران نیز گنلتے اند جنہیں  
شودش آلودہ رفتے اند ہر  
در نمودِ گزارشِ زوہ ہا  
اکثر از عالم "شباب زوہ"  
"سے زوہ"، "غم زوہ" کہ ترکیب است  
چوں برآید ز انگلیں سوش

وی خود از خانِ فاعل است کہ بہت  
ہم چنان آں محیطِ بے ساحل  
از منبتِ حکایتے دادو

بود خائستہ مرا تسلیم  
ناد در زیر لب گداختے  
بے سنی، ہمد شمع سوختے ۶۰  
رنگے از جوشِ ایں بہاروں بود  
خوش تر از باغ و بوستانِ بیوں  
ایں نوا می خود بہ پردہٗ گوش  
طنفہ بر طنفہٗ فقیر زوہ است  
"زوہ" را می زند، چہ انصاف است! ۶۵  
شطہ در مغزِ استخوانِ زوہ است  
پاسے وحدت بود امانت نیست  
در خود سرزنش ہمیں نہ منم  
گوہرِ راز شستے اند ہمیں  
ہم بریں چلوہ رفتے اند ہر  
کردہ اند از لٹاٹ عریہ ہا  
"سے زوہ"، "غم زوہ"، "غراب زوہ"  
بہ خیالی فقیرِ تھلیب است  
"زوہ غم" وہ ز مٹوش

۷۵

حق بود حق، نہ باطل است کہ بہت  
قزم فیضِ میرزا بیدل  
کہ ہرمنان ہدایتے دادو

”ماشتے، بید لے، جنوں زدہ  
کردہ ام عرض پہچان ”زدہ“

(گرچہ بیدل ز اہل) لہاں نیست  
(صاحب) جاہ و دستا ہے ہو  
نہ غلط گفتہ است وہ خود گفت  
دعویٰ بندہ بے سر و نہی نیست  
چارہ از کلام اہل زباں  
تا بدی پدہ آشنا کوند  
وہ کہ دیگر ز جاہ پر گشتم  
سادہ لوم مرا چ رنگ و چ رو  
من کہ و عزم دلوری کون؟  
خاکِ پاسے سُخندالستم  
با بزرگاں نیازبا دارم  
بندہ ام بندہ مہربان را  
نہ ز آوہنشی بیاں ترسم  
کہ پس از منی بہ ساماے دراز  
کہ سنجے رسیدہ ہو درخا  
با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت  
شوخ چنے و زشت خوے ہو  
ہم سفیانہ گفتگوے داشت

ہمے ماشتے بہ خوں زدہ  
عظمت پر بر بے کراں زدہ؟ ۸۰  
بہ خیال فقیر مطلوب است  
(لیک) بہوں قتیل ندواں نیست  
(مرو را) زنی نہد کلا ہے ہو  
راست گویم وہ آشہ و نعت  
شیر بیدل بجز گفتنی نیست ۸۵  
ی فرستم بہ خدمتِ یاراں  
با می دار ہستوا کوند  
خیرہ ہوم سفیر تر گشتم  
آؤخ آؤخ، ز جاہانہ غریہ  
سازِ بزم سُخندوی کون! ۹۰  
دوستان را ز کھترالستم  
ہم بدی شیبہ نازبا دارم  
رمز نصاں و کمتہ دانان را  
منی و ایمانی منی، کزاں ترسم  
بہ زباں مانہ ایں خلایت باز ۹۵  
چند روز آرمیدہ ہو درخا  
زحمتے ولو و راہِ خویش گرفت  
بے حیاے و ہرزہ گوے ہو  
ہم خراہاتیانہ ہوے داشت

- برگِ دُنیا نه سازِ دیش بود  
آل از آل دم که بهد رفتی من  
تا بوم رنجِ دوستانِ باشم  
تاو گوید کز میانِ بوم  
خسته و مستند بر گوم  
به دوام کس از شا نزد  
زی سپس نیست دعوی ختم  
ناله بے سرو، چوں جری نه زخم  
نکتم بر ریخِ بیاں رنگ  
تاسو پشام، خدا را نیست  
ولی که در پیشگاهِ بزم خنی  
که لعل با قلیل نیکو نیست  
خود کے نامرا چرا گوید  
لیخن از صبتِ قلیل نیست  
نه هوا خوابی، نه دشمنی  
ماش طر، که بهد نمی گوم  
مگر آنانکه پادسی دانند  
که ز اہلِ زہاں نه بود قلیل  
لاجرم احتماو را نه سرزد  
کای زہاں خاصِ اہلِ ایران است  
منی است آشکار پنهان نیست
- تنگِ دلی و سرزمینش بود ۱۰۰  
خونِ دلی بود به گردن من  
بر دلی انجمنِ گرایی باشم  
آوخ از من که من چنان بوم  
دم آیم زنده بر گوم  
شوق را مشوہ وفا نزد ۱۰۵  
نه دم دوو شیخ ز انجمن  
بے صدا گوم و نفس نه زخم  
بر نه خیزد ز سارم آہنگ  
مربانان، دل است، ظارا نیست  
به زبانها فتاده است (ز من) ۱۱۰  
(گسِ خوانِ لغت او نیست)  
نامرا آل که نامرا گوید  
رکب بر شہرتِ قلیل نیست  
درمیان است پاسے ہفتی  
و آل ہم از پیشِ خود نمی گویم ۱۱۵  
ہم بری قول و عہد و پیمانند  
ہرگز از اصنافِ نہ بود قلیل  
قول و اشتہار را نه سرزد  
مشکلی ما و سہلی ایران است  
دلی و لکھتو ز ایران نیست ۱۲۰

- دوستان را اگر ز من گد است  
 ی روم از چنے قتل ہر  
 تو ازین عقد چوں بدر زدہ  
 اسے ترشانیان زرت کلام  
 کہ چوں از عزی بہ چم سر  
 دل دہد کز اسیر برگوم  
 دامن از کف کنم چگونہ رہا  
 پردہ سخانی باستانی را  
 حامد روح و روانی معنی را  
 آن کہ از سرفرازی قش  
 طرز تریر را نوی از وے  
 ہست معنی قوی ز پہلویش  
 طرز اندیش آفریدہ او  
 لغتہ گلگونے (اینانم)  
 یک ہا آن ہر کہ این دارم  
 (ی شوم خویش را بہ صلح دلیل)  
 تا زمانہ دگر ز من گد  
 گفتی آنہی ہوشیاری نیست  
 کہ چہ اندیش خواہم گفت  
 (ایک) از من ہزار ہا بہ است  
 من کف خاک و گو سپر بند
- کہ خرامت غوط کاہد است  
 ساختہ مرو را دلیل ہر  
 گام بر جاوہ دگر زدہ  
 ہاں، بگوئید حسرتہ خدا  
 آن بہ جاوہ دخی، بہ دہر سر ۱۲۵  
 ز آن نوآئیں صغیر برگوم  
 صائب و غری و ظہیری را  
 طالب و سدی و فغانی را  
 آن قصوری، جہانی معنی را  
 آسمان ساختہ پرجم عطش ۱۳۰  
 صغر در تجب بانوی از وے  
 حامد را فرہی ز بازویش  
 دزد تہی لفظ (ہاں وسیدہ) او  
 ست لاسے (مہوے اینانم)  
 گنج معنی در آستین (دارم) ۱۳۵  
 ی سرایم نواسے مدح قتل  
 رسد از پیروانی وے صلہ  
 یک دالستی استیاری نیست  
 سدی تانیش خواہم گفت  
 از من و بچہ من ہزار بہ است ۱۴۰  
 خاک را کے رسد بہ چرخ کند

وصفِ لوح (چون) سے نہ ہو      سرِ درخوردِ روزنے نہ ہو  
 مرجا سازِ خوش بیاقی کو      جہاں شورِ کشتِ دانی کو  
 نقشِ آبِ حیاتِ را ماند      درِ روانی، فراتِ را ماند  
 نثرِ کو ہالی نقشِ ملاس است      انتخابِ صراح و قاسوس است ۱۳۵  
 بہ وجودِ چنیں گلرغِ بیاں      کھوہِ داروِ جہم ز ہندستان  
 ایں رقبا کہ رختِ گلکِ خیال      ہو سطرے ز نثرِ اعمال  
 از مہیِ نارماتے بیکِ دال      سعادتِ نامہ ایست دسی پاراں  
 ہو کہ آید ز عذرخواہیِ ما      رحمِ بر ما و بے گناہیِ ما  
 آشتیِ نامہِ دواؤِ پیام      ختم شد والعلوم والا کرام ۱۵۰

[اے بزمِ سخن کے تماشا نویس، اور اے ناوردِ لیسیا! تمھو!]  
 اے دنیا سے حرف کے پیش قیمت لوگو، اے سیدِ عجیب کے خوش نشینوں!  
 اے گلشن کے سنی پرورد، اور اے گلشن کے زبان آور لوگو!  
 (آپ میں سے) ہر ایک کسی ہارگاہ کی بزم کا صدر ہے (اور) کسی خلوت سراے  
 کارگاہ کی شمع ہے۔  
 (آپ میں سے) ہر ایک کسی قافلے کے ہر لول میں (اور) ہر ایک کسی مرتجے کا مالک  
 ہے۔  
 اے (وہ شخص) کہ شعلِ وکالت پر آلودہ (ہے، اور جس نے) غمِ خواری جہاں کی دلو  
 دی ہے۔  
 اے دنیا سے دل کے حیرت انگیز لوگو، (کہ) اطراف سے سفارت کے لیے پہنچے ہو۔  
 اے (عاطلوں) کہ تم نے) شر کو نقشِ ہاں دیا ہے، (اور) صفے کو جہن کی سی آرائش  
 بخشی ہے۔

اے گیتی کے مغز پر حطر چمڑکنے والوں (اور اے) پہلوی جاننے والے طاقتور! اے اردو غزل کے گرائی مرتبہ فی کاروہ اور اے غواصانِ دریاے ساقی! اے اس بڑے شہر کے رئیس اور اے (وہ حضرات جو) بہت اللہیم سے یہاں جمع ہو جانے والو!

(اور اے وہ لوگو) جو میری طرح اس شہر میں آکر آسودہ ہو گئے ہیں، (اور اے وہ لوگو) جو اس شہر میں کسی کام سے آئے ہو!

بد قسمت امداد (جو) جز کے پیچ و خم میں سرگشتہ ہے۔  
اگرچہ تھارانا خواندہ میماں ہے... بے شک وہ تھارے خوان کارنہ ہیں۔  
اس جگہ وہ دلو خواہی کے لیے آیا ہے اور کسی امید کے سہارے یہاں اقامت گزیں ہے۔

تم اس شگہاندے کو سایہ دل میں چاروں آرام کر لیٹے دو۔  
مصان کو نوازنا رسم ہے (اور) اس کے کام کو آسان بنانا (بھی) رسم ہے۔  
وہ ساری کار سازی کی رسم کہاں (گئی، اور) مصان نوازی کا (وہ) شیوہ کہاں (گیا)۔  
میں کون ہوں؟ ایک غم زدہ، دل شکستہ، بے دل، دواندہ اور ستم زدہ (شخص!)  
بے تابی کی بھلی جس کے دل پر گری ہو اور آتشِ غم جس کے جانناں میں لگی ہو۔  
گدازِ نفس سے تاب و تنی میں (میری حالت) بنایاں میں ایک خنہ لب کی سی ہے۔  
میں میطِ بلا میں ایک ایسا سینا ہوں جو طوفان میں گھرا ہوا ہوں، (اور) سر بسر گریو کا دوانہ ہوں۔

قتا ہوں۔

میں ایک جگر گداختہ درد مند ہوں جس کا غم دہر سے زہرہ بچکل چکا ہے۔  
(میں وہ ہوں کہ جس نے) فنا کی آگہی کے دوا لے پر دستک دی ہے، (اور جس نے) قرابت اور خوشی کو کھینچا شکر اویا ہے۔

میں نے کبھی کبھی مشکلات برداشت کی ہیں تب کہیں جا کر یہاں پہنچا ہوں۔  
میری مسافت کے تاریک دلوں کو دیکھو میری وحشت کی سپاہِ راتوں کو دیکھو۔



وطن سے (سیری) دوری پر طور کو، (اور لہنوں کی) انہیں کے غم بھر پر طور کو۔  
 صرف یہی نادر و غیاں میرے لب پر نہیں ہیں۔ مجھے قسم ہے خدا سے جاں آکر میں کی،  
 کہ میں جان بہ لب ہوں۔

گر یہ وزاری نے مجھے ہال (کی طرح ضیعت) کر دیا ہے (اور) رنج نے مجھے بد خو بنا دیا  
 ہے۔  
 (اس حالت میں بولا) مجھے شعرو سخن کا ذوق کہاں ہو سکتا ہے۔ سخی صرا زباں میرے  
 پاس کہاں ہے!

میرے دکھ نے مجھے خوار کر دیا ہے۔ مجھے (بولا) سخی ہمدی سے کیا کام!  
 اللہ اپنی ہرزہ گوئی کی وجہ سے لہنی بے نواقی پر فوج کرتا رہتا ہوں۔  
 میں اپنے روتگار کی گوش ہوں (اور) اپنے کاروبار کی صیرت۔  
 مجھ جیسے شخص سے یہ حصہ اور یہ کون، افسوس، افسوس! میں کیسا ہوں اور میرے ساتھ  
 (یہ) کیا ہوتا ہے، افسوس، افسوس!

مسافروں پر ستم کہاں جانتا ہے۔ اگر رحم نہیں ہے تو ستم کیوں ہے۔  
 اور اگر احوالی گذشتہ کی بات کرتے ہو (کہ) تمہ سے گفت گو میں ایک خطا سرزد ہوتی  
 ہے۔

(لو) اے میرا خدا کے واسطے اصاف (کہو، بولا) اختلافت کی ابتدا کس نے کی  
 تھی؟  
 صرا ب کے سب میں شک کس نے ڈالا (اور) ہمیں میں مختصر خزاں کس نے برپا کی  
 تھی؟

گفت گو کی زلفت کو کس نے پریشان کیا اور بزم شعر کس نے برہم کی؟  
 کس نے پہلے کہا کہ "ہمد عالم" غلط (ترکیب) ہے۔ اس قسم کی باتیں پہلے کس نے  
 کہیں؟

"بیش" کو "بیش تر" کس نے کہا۔ مجھ سے پہلے برا کہنے کی ابتدا کس نے کی؟

کس نے کہا کہ ”ٹوے برکمر“ غلط ہے (اور) شعر کو سر بسر کس نے خط کیا؟  
جب تم نے دیکھا کہ اعتراض غلط ہے، (اور) جو کچھ بھی غالب نے کہا ہے، ٹھیک  
ہے۔

(تو) ہانڈس کے دھاگے کو بل کس نے دیا تھا (اور) مسترض کو میری طرف سے  
کس نے جواب دیا تھا؟

تم نے جب میری بے گناہی دیکھی، (تو) تم نے میری نوسپاہی کو کیوں نہ دھوکا؟  
میں نے جسے بھی دیکھا وہ خاموشی کے راسخے پر گیا، (اگرچہ) اس موقع پر گرفت لازم  
تھی۔

اُس وقت خاموش رہنے کا کیا باعث تھا، اچھی کے راسخے میں دم نہ رکھنے کا (کیا  
باعث تھا؟)

(کیا باعث تھا) میری مدد میں لب نہ کھولنے کا، عرصہ دو خواہی میں مجھے حیران چھوڑ  
دیئے کا؟

غمِ دل نے مجھے تنگ کر دیا (اور) میں نے اپنا رخ ایک گروہ کی طرف پھیر لیا۔  
میں نے گھر مندا نہ گفت گو کی (اور) بات کرنے میں تصورِ غلو بھی ہو گیا۔  
میں نے جب سنا کہ نکتہ پرواز، تھروان اور انجمنِ ملا حضرات  
اس جواب کی بنا پر مجھ سے آزدوہ میں (تو) میں نے اپنا چہرہ دما کے لیے خاک پر ملا۔  
مجھے شرم آئی اور میں جمنوں ہو گیا۔ میں نے خود کو پانی اور (لہسنی) آنکھوں کو خون کر

دیا۔

میں پانی ہو کر چپکتا رہا، (گویا) قطرے کی طرح سر کے بل دوڑا۔  
لیکن سانس کو پھر بھی ٹھہرو نصیب نہ ہوا، (اور) کسی نے میری نیا زمندی کی پروا نہ  
کی۔

(بلکہ) انہوں نے اپنے دھوے کا رخ میری طرف کر دیا، اور میرے کام کو میرے  
سامنے لے آئے۔

میں ان ماسٹوں سے داغ ہو کر رہ گیا (اور) فرزندگی کی آنچ سے جل گیا۔  
 مجھے شاعری سے نہ کوئی امید ہے اور نہ کوئی خوف، لیکن میرے لیے مناسب یہی تھا  
 کہ تسلیم اختیار کر لوں۔

کاش، میں اعتراض کو برداشت کر سکتا، (اور) اپنے نالے کو زیرِ لب ہی چھپا دیتا۔  
 دھوے کے پھرے کو براؤنرخت نہ کرتا، (اور) خاموش شمع کی طرح جلتا رہتا۔  
 چوں کہ دوستوں کی رمتا اسی میں تھی، (اور) یہ بھی اس بہار کے جوش کا ایک رنگ  
 تھا۔

(چوں کہ) داغ و بوستل بننے سے دوستوں کے دامن کا خار ہونا بہتر ہے۔  
 مزید یہ کہ خاموش کے ہزاروں رنگوں کے ساتھ یہ آواز میرے کان کے پردے سے  
 ٹکرا رہی ہے  
 کہ کسی اور بلبل نے زمزمہ سرائی کی ہے اور حقیر کے طعنے پر طعنا دار ہے۔  
 باوجود اس کے کہ میرا شرمناک ہے۔ (قر) ”زود“ کو داتا ہے، یہ کیا انصاف ہے۔  
 (اس) اعتراض نے میری جان میں آگ لگا دی ہے (اور میری) ہڈیوں کے گودے  
 میں شعلے برسرِ کاؤ پے ہیں۔

”زود“ کا کسرہ غلظی طبع کے لیے نہیں۔ یہ یا سوجھت تھی، امنافیت نہیں۔  
 اس زمینی کا وضع کرنے والا میں نہیں ہوں، (اس لیے) سرزنش کے لائق صرف میں  
 ہی نہیں ہوں۔

اور لوگ بھی ہیں جنہوں نے اسی طرح کہا ہے اور راز کے موتی پروتے ہیں۔  
 سب شور و کشادہ لوگ ہا کچے ہیں (اور) وہ بھی اسی راستے پر چلے ہیں۔  
 انہوں نے ”زود ہا“ کے عرصہِ انتظار میں مزے لے لے کر جگڑے کیے ہیں۔  
 اسی عالمِ شبابِ زود میں اکثر لوگ ”سے زود“، ”غلم زود“، ”طراب زود“ (ایسی  
 ترکیب کا استعمال کرتے رہے ہیں۔)

”سے زود“ اور ”غلم زود“ (بھوسی) جو ترکیب ہے (وہ) ہودی کی رائے میں ترکیبِ

مقلوبی ہے۔

جس طرح انگلیں سے موسم برآمد ہوتا ہے اسی طرح اس (ترکیب کے) مضموم سے "زودہ غم" لگتا ہے۔

اور یہ (ترکیب) غم و ملامت کا حکم رکھتی ہے۔ حق تو ہر حال حق ہی ہوتا ہے وہ باطل تو ہو نہیں سکتا۔

جس طرح اس دریا سے بے کنار، ہریم فیض مرزا (عبدالقادر) بیدل نے ایک حقیقہ حکایت لکھی ہے، (اور اس میں) اسی طرح کی ایک اختراع کی ہے:

"ایک بیدل عاشق، ایک جنوں کا مارا ہوا، ایک (ایسا شخص) جس نے خون کا ہرج ماشقی پیا ہو۔"

میں نے بھی "زودہ" اسی طرح عرض کیا ہے، (البشر) تو نے (اس) مجربے کراں کو طعنہ دیا ہے۔

۔۔۔ ہمدی کے خیال میں مقلوب ہے۔

اگرچہ بیدل اہل ایران میں سے نہیں، تاہم وہ قلیل کی طرح بدعقوف نہیں ہے۔ وہ صاحبِ جاہ و صاحبِ علم تھا اور اس کی ٹہنی ندے کی تھی۔

اس نے غلط نہیں کہا، یہ حق بات میں اعلانیہ اور پوشیدہ (ہر طرح) لگتا ہوں۔

ہند سے کا دھوا بے سرو پا نہیں ہے۔ بیدل کے شعر میں بہت سے رنگ ہیں۔

میں اپنے ہم عصر شاعروں کے کلام میں سے کچھ (کلام) یادوں کی خدمت میں بھیج رہا

ہوں۔

تاکہ وہ بھی اس پردے سے آشنا ہو جائیں اور مجھ عاجز کے ہم خواہی بن جائیں۔

افسوس کہ میں پھر راجت سے ہلک گیا۔ بے لوب تو تھائی اور بھی بے ہودہ ہو گیا۔

میں سادہ لوح ہوں۔ بھلا مجھے کمر اور جیلے سے کیا (سروکار)۔ افسوس، افسوس، (اس)

جاہلانہ شعور عموماً پرا

(بھلا) میں کون ہوں کہ دھوا سے داوری کروں اور برسم سخیوری کو آرائش دوں۔

میں (تو) شعرا کی خاک پاہوں اور دوستی میں بھی چھوٹوں میں سے ہوں۔

(البشر) بزرگوں سے میری نیازمندی ہے (اور) میں اسی طرز پر فکر کرتا ہوں۔

میں مہربانوں، درمغفوں اور گنتہ دانوں کا عظیم ہوں۔

میں اپنے بیان کی ہلکھل خیر سی سے نہیں ڈرتا، مجھے اپنے ایمان کی قسم، اگر میں اس

سے ڈرتا ہوں!

(در اصل میں اس سے ڈرتا ہوں کہ) میرے بعد مدتِ مدید تک لوگوں کی زبان پر یہ

حکایت رہے گی

کہ ایک بے ہودہ انسان اس جگہ آیا تھا (اور) اس نے چند روز یہاں آرام کیا تھا۔

(اس دوران میں اس نے) بزرگوں سے لڑائی سول لی، انھیں رنجیدہ کیا اور اپنی راہ چلا

گیا۔

(وہ) شوح چشم اور بد خواہ، (وہ) بے ہرم اور ہرزہ گو تھا۔

وہ بے ہودگی سے بات چیت کرتا تھا اور اس میں ضرابیوں کی سی مادیات تھیں۔

نہ مال نہ دنیا ہی اس کے پاس تھا اور نہ تھوہریں۔ وہ دہلی لود اس کی سرزمین کے لیے

باعثِ ہرم تھا۔

افسوس (ہے مجھ پر) کہ میرے جانے کے بعد دہلی کا خون میری گردن پر ہوا

(اور) جب تک میں رہوں، دوستوں کے لیے رنج کا باعث رہوں (اور) انھیں کے دل

پر بوجھ خاں رہوں۔

(افسوس ہے مجھ پر کہ) جب میں چلا جاؤں تو (وہ لوگ) تو خوش ہو جائیں۔ افسوس ہے

مجھ پر کہ میں اس طرح (یہاں سے) جاؤں۔

(افسوس ہے مجھ پر کہ) میں خستہ اور غم گین واپس جاؤں۔ غم گین آؤں اور غم گین

(ہی) جاؤں۔

مجھے دواغ کرنے تم میں سے کوئی نہ جانتے۔ شوق کو دواغ کی خوش خبری نہ مل پاتے۔

اس کے بعد مجھے دعوایے سنی دہی نہیں، میری افسوس میں اب شیع سے دعوای نہیں

اٹھے گا۔

(اب) میں بے مقصد جرس کی طرح نالہ نہیں کروں گا۔ میں جاسوش رہوں گا، دم نہیں ماروں گا۔

سیرے بیان کے پھر سے پر آئندہ ہر مندگی نہ آنے گی (اور) سیرے ساز سے (آئندہ) کوئی لغو نہیں اُبرے گا۔

خدارا، اب مجھ میں ہٹا سے کی تاب نہیں۔ اے میرا دل، یہ (سیرا) دل ہے، (کوئی) پتھر نہیں ہے۔

اور یہ کہ بزمِ سخن کی ڈھورھی میں لوگ مجھ سے منسوب کر کے یہ کہنے لگے ہیں کہ قلیل نے قلیل کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ اس کے خواہیِ نعمت کی بکھی نہیں (بنا۔)

(تو اس بارے میں سیری راے یہ ہے کہ) خود (سے) کوئی شخص نانا نسا بات کہیں کھے، (بات یہ ہے کہ دراصل) نانا نسا (شخص) وہی ہوتا ہے جو نانا نسا بات کہے۔ میں نے قلیل کی صحبت سے کوئی فیض حاصل نہیں کیا، (اور) مجھے قلیل کی شہرت پر کوئی رنگ بھی نہیں۔

میں نہ تو اس کے ہوا خواہوں میں ہوں اور نہ دشمنوں میں، سیرے اور اس کے درمیان (تو قلیل) اشتراکِ فی کار شے ہے۔

حافظ، کہ میں (قلیل کو) برا نہیں کہتا اور (اسی سطلے میں) جو (بھی) کچھ کہتا ہوں، اپنی طرف سے نہیں کہتا۔

مگر وہ لوگ جو لاری کا طم رکھتے ہیں، اس بات پر مستحق ہیں کہ قلیل اہلِ زبان میں سے نہیں تھا۔ قلیل اصحابِ کارہننے والا ہرگز نہیں تھا۔ (اس کی زبان) جیوناً اعتماد کے لائق نہیں۔ اس کا قول اشتاد کے لائق نہیں۔ چوں کہ یہ زبان خاص اہلِ ایران کی ہے۔ ہمارے لیے مشکل (تاہم) ان کے لیے آسان ہے۔

یہ بات بڑی واضح ہے، (اس میں کوئی جھین) پوشیدہ نہیں۔ (ظاہر ہے کہ) دلیل اور  
لکھنؤ والے کا حصہ نہیں، ہیں۔

دو مسئلوں کو اگر مجھ سے گھر ہے کہ تیری روش کاٹنے کے خلاف ہے۔  
ہم سب قبیل کی پیروی کرتے ہیں۔ ہم نے خاص طور پر اس کو (اپنے لیے) دلیل بنا  
لیا ہے۔

(تو آخر) تم کیوں اس دائرے سے باہر چلا گیا ہے اور گونے دو سر راستہ (کیوں)  
اختیار کر لیا ہے۔

اے گھری نظروں والے تماشائی، تم ہی بتاؤ، اللہ تعالیٰ حفاظت کرے،  
کہ میں شیخ علی حنفی سے منہ کس طرح موڑ سکتا ہوں۔

کیا دل اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ اسیر سے منہ موڑ لیا جائے اور اس طرح لوٹانے  
والے نعرہ سنج سے منہ موڑ لیا جائے۔

اپنے ہاتھ سے دامن کس طرح چھوڑ دوں مناسب، عربی اور نظیری کا۔

تھکیم پردہ سنہوں کا، طالب اور سعدی اور فنا فی کا،

بالخصوص روح و دہانی معنی کا، (یعنی) عسکری (کا، اُس) جہانی معنی کا۔

وہ (عسکری) جس کے قلم کی سرفرازی ہے، اس کے قلم کا پریم آسمان کی طرح

ہے۔

طرزِ تحریر کو اس سے بدلتا لی۔ صفائی کا مرقع اس کی وجہ سے ہے۔

معنی کی پشت اس کے پہلو سے قوی ہے، (اور) قلم کی قربی اس کے ہانڈ کی وجہ سے

ہے۔

گھر کا انداز اس کا پیدا کیا ہوا ہے، لفظ میں جان اس کی پھونکی ہوئی ہے۔

میں ان ہی لوگوں کی گفتگو کا آشوب ہوں۔ میں ان ہی کی سب کی تلخ (ہی) کہ

(اس) سے مست ہوا ہوں۔

لیکن اس کے باوجود کہ میں یہ (سب کچھ، یعنی ان شعرا سے حصولِ فیض کی سعادت)

رکھتا ہوں، میں اپنی آستین میں (بھی ایک) گنچ معنی رکھتا ہوں۔

میں اپنے آپ صلح کی خاطر ہاتھ بڑھاتا ہوں، (اور) قلیل کی مدح سرائی کرتا ہوں۔  
تاکہ آئندہ مجھ سے (کسی کو کوئی) گھڑ نہ رہے (اور) اس کے پیروں سے کوئی صلہ۔

—

منہ سے (ہن) بات کا کلمہ دینا آئین ہوشیاری نہیں، لیکن کسی بات کا سمجھنا احتیاری  
(بھی تو) نہیں۔

اگرچہ میں اسے (یعنی قلیل کو) ایرانی نہیں سمجھوں گا، (اور) میں اسے سودی ثانی (بھی)  
نہیں سمجھوں گا۔

تاہم وہ مجھ سے ہزار بار اچھا ہے۔ مجھ سے اور مجھ جیسوں سے ہزاروں بے اچھا ہے۔  
میں تو ششی نجر حاکم ہوں، اور وہ آسمان بلند (ہے)، حاکم (بھلا) آسمان پر گھنڈ کب  
ڈال سکتی ہے۔

اُس کی تعریف مجھ جیسے انسان کے بس کی نہیں، (جس طرح) سورج کسی روزن کے  
لائق نہیں ہو سکتا۔

اس کے سبب خوش بیاہی کے کیا کہنے! خوفناک اس کی نکتہ دانی کی شہرت کے!  
اس کا شعر آپ حیات کی مثال ہے، (اور) روانی میں وہ (دریا ہے) لڑات ہے۔  
اس کی نثر سور کے پدوں کا نقش ہے۔ (اپنے اسلوب میں یہ نثر) ”سراج“ اور  
”کاموس“ کا انتخاب ہے۔

اس جیسے مجزیان کے ہونے کی وجہ سے مجھ کو بندوستان سے شہادت ہے۔  
یہ قہر رزی، جو گلک خیال نے پیش کی ہیں، (در اصل یہ سب مل کر) نامہ اعمال کی  
ایک سطر تھی۔

مجھ نادان و نارسا شخص کی طرف سے یادوں کی جانب (یہ) ایک معذرت نامہ ہے۔  
امید ہے کہ میری عذر خواہی سے مجھ پر اور میری بے گناہی پر (انہیں) رحم آجائے۔  
یہ آشتی نامہ جو دوستی کا پیام ہے، (اب) ختم ہوا۔ والسلام والا کریم!]





## ضمیمہ: ۳

### عالم کی عرض داشت بنام فریئر صاحب معروضہ اشائیںس اپریل ۱۸۴۸ء کی نقل

صاحب والاخانقبہ والاخان، والدور داورس، فیض رساں، دام شوکتہ کی خدمت میں  
عرض کردی کی عزت حاصل ہو!

ہدوی دنیا کو اپنے جتنے میں رکھنے والی انگریز بہادر دام اقبال کی نگہبانی کی سرکار کے  
قرب خواہوں اور اس ہمیشہ قائم رہنے والی سلطنت کے شک خواہوں اور پاکستان میں سے ہے۔  
ہدوی کے گلے بھا ہمارا بیگ خان والا مرتبت جنرل لارڈ لیک صاحب کے عہد میں سرکار  
کی طرف سے ہار سو سواروں کے رسالہ ار تھے اور انہیں ایک لاکھ روپے کی جاگیر عطا ہوئی  
تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے متعلقین کی پرورش کے لیے ایک مقررہ رقم، جو سرکار  
سے ملتی تھی، احمد بخش خان جاگیر دار میرات کی جاگیر میں خالی کر دی گئی۔ میں ہدوی چوں کہ  
اس (رقم) کی مقدار کے تعین اور احمد بخش خان کے طریقہ تقسیم پر راضی نہیں ہوں، (لہذا)  
اپنے عرضی احوال کے لیے لکھتے آیا ہوں، اور ایک عرض داشت لایع النور نواب سلطان اقبال  
نواب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہدوی کے، ریزیدنٹ صاحب  
شاہ جہان آباد سے، رجوع نہ کرنے کی دو جہیں ہیں۔ ان میں سے ایک احمد بخش خان کے  
ظلم و ستم برداشت کرنے اور ہجرت پور کی فتح تک احمد بخش خان کے وعدے کی امید میں  
اُس سفر میں سرگشتہ رہنے اور احمد بخش خان پر اپنی جہت تمام کر دینے اور عرض خواہوں کے  
پٹا سے کے خوف سے اپنی آمو جانے کی خاطر شاہ جہان آباد نہ جانے، بلکہ مازم کان پور  
ہولے اور کان پور میں بیکار ہو جانے سے متعلق (ہے اور) مفصل حصار پر نور کے عکاسوں کی

مرض داشت میں مروض و مرقوم ہے۔ دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ دستاویز، جو لدوی کے دعوے کی بنیاد ہے، شاہ جہان آباد کی ریزیڈنسی کے دفتر میں نہیں ہے، یعنی وہ رپورٹ، جو جناب والا مرتبت برٹیل لڈ فیک صاحب بہادر نے احمد بخش خان کی جاگیر اور اس پر سرکار کے زیر استراعی کی صفائی کے سلسلے میں، ۱۸۰۶ء میں، کان پور سے لکھنے بھیجی تھی۔ اور لہذا اس رپورٹ کی نقل اور اس کی مستوری کے کوائف لکھنے کے دفتر میں ہوں گے، اور اس کے ساتھ (جی ساتھ چوں کہ) وہی اور لکھنے اور ہندوستان کے سارے شہروں میں سرکارِ دولتِ مدار کا وہی ایک قانون ہے، اس لیے یہ لدوی انصاف اور کام یابی کی امید لے کر، بیداری، نا اتفاقی اور بے سرو سامانی کے عالم میں دو سو فرسنگ کا راستہ طے کر کے اس محلِ گاہ تک پہنچا ہے اور ان سب باتوں کے باوجود میرا مقدمہ سرکارِ جہاں مدار کی خیر اندیشی اور ہوا خرابی سے مترا نہیں ہے۔ چنانچہ میری مفصل مرض داشت کے مطالعے سے واضح ہو جائے گا۔ (مجھے) امید (ہے) کہ (آپ) لدوی کی مرض داشت بند کال حضورِ الٰہی کی نظر فیض اثر سے گزر دیں گے۔ واجب تھا، (سو) مرض کیا گیا۔ دولت و اقبال تابان و درخشاں رہے!

عرضے

اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ

برلورڈ لودہ نصر اللہ بیگ خان

جاگیر دار سوٹک سونا

شرح خلاصہ:

والا مرتبت، والا خان، دلور و لدوی، فیض رساں

فریڈ صاحب بہادر دام شوکت کی نظر فیض متحر ہے گزے۔

مرض داشت اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ برلورڈ لودہ نصر اللہ بیگ خان جاگیر دار سوٹک سونا

مروضہ ۲۸ اپریل ۱۸۴۸ء



ہوں کہ یہ جگہ بہ جبر لی جا رہی ہے، حالات میں سے کسی ایک شخص کی نالائش بھی نہیں سنی  
ہائے کی۔

چاہیے کہ اس علیہ عظمیٰ کے سبب حضور کی منت کے منوں اور ہمیشہ سرکارِ معظم  
الیہ کی خیر اندیشی و جان فطانی میں مصروف رہیں کہ (وہی) آپ کی بھلائی اور بہبودی کا باعث  
ہوگی۔

مرقوم چارم یوم سنہ ۱۸۰۶ عیسوی، مطابق چودھویں، صفر ۱۲۲۱ ہجری المحدثہ

\* \* \*

## ضمیمہ: ۵

شہادت و عوامی مرتبت نواب صاحب مہربان دوستاں نواب احمد بخش خان بہادر  
سلطہ اللہ تعالیٰ!

چوں کہ مرزا نصر اللہ خان مرحوم کے پس ماندگان کی خود پرداخت ارکانی سرکاری  
دولت مدار گنجینی بہادر دام اقبالہ کو مرکوزہ مستور ہے، اور اس سے پہلے جو سند گورنر جنرل  
بہادر کی جانب سے آپ کو عطا ہوئی ہے، اس میں بھی یہ امر مجملہ مندرج و مرقوم ہے، لہذا  
تقریر کیا جاتا ہے کہ مبلغ پانچ ہزار روپیہ مکمل رنج الوقت پر گئے گا، جو اس شہادت مرتبت کو  
حضور (گورنر جنرل) سے مرحمت ہوا ہے، مندرجہ ذیل تفصیل کے مطابق، مرزا مرحوم کے  
متوفیوں کو حساب کے مطابق ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال پہنچاتے رہیں کہ وہ لوگ اس کو اپنی  
معیشت کے لیے خرچ کر کے اپنی مدد و مدد کی ضرورت کے ایزاد کی دعا میں مشغول و مصروف  
رہیں۔ اس ذیل میں تاکید کو مکمل جہاں کر عمل کریں۔

### صحت ۱۲

خواجہ حاجی	والدہ و ہمشیرہ مرزا مرحوم	مرزا نوشہ مرزا یوسف برادر لدا مرزا مرحوم
مبلغ دو ہزار	مبلغ پندرہ سو	مبلغ پندرہ سو

مرقوم ہفتہ ماہ جون ۶-۱۸۰۶ عیسوی، مطابق انیسویں ربیع الاول ۱۲۳۱ ہجری

ضمائم از مترجم

## ضمیمہ: ۱

”نار ہای فارسی غالب“ میں شامل چھ خطوط ایسے ہیں جو ”تنج آہنگ“ میں بھی شامل ہیں۔ دونوں مجموعوں میں شامل ان متون میں خاصا فرق ہے۔ ذیل میں ”تنج آہنگ“ میں شامل متون کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

۳  
—  
۳

قبلاً جان دول، (خدا آپ کو) سلامت (رکھیے)!

لدوی قسیمیات کے بعد اپنے احوال کے ذکر کی طرف مائل ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ دوسرے اور بھار کی تعلیم کے اثرات باندھے ہی سے زائل ہو گئے تھے۔ تھابت اگر باقی ہے باعثِ شکرِ بیش نہیں۔ چوں کہ یہ وہ ساتھی ہے جو وطن ہی سے سیریِ رفاقت پر مکر بست ہے۔ اس کی حق گزادی کا منصب بھی مستحکم ہے اور اس کی دلاوری کا سایہ بھی مرضِ ثانوی کا کارفرما ہے۔ آخر کار میں پیر کے دن سوڈہ سے روانہ ہوا۔ ایک گاڑی، جسے اس سڑکے میں ”ٹھا“ سمجھتے ہیں، سامان اٹانے کے لیے مجھے دستِ یاب ہوئی۔ چوں کہ وہ ضیفی میں مجھ سے بڑھ کر واقع ہوئی تھی، جسے آہستہ خرام، بلکہ خرام، سمجھنا زیادہ مناسب ہوگا، اس لیے وہ بارہ کوس کا فاصلہ طے کر کے سوڈہ سے چلے آیا۔ ایک نیک نہیں پہنچ سکی۔ یہاں تک کہ چار راتوں تک ایک گاؤں میں بسیرا کرنا پڑا۔ سگن کو رات گئے روانہ ہوا اور دوپہر وہاں چڑھے میں خود چلے آیا۔



کی کارواں سراسے میں پہنچا اور وہ گاڑی، جسے جنبش کرنا مشکل تھا، اس وقت تک نہیں پہنچی، جب تک خوب رات نہ ہو گئی۔ اس وقت کہ ابھی طرسموں نے چرخ بھی روشنی نہ کیے تھے، میں نے رات کے اندھیرے میں ایک خط گھوڑا۔ اور چوں کہ مرزا سعل صاحب نے مجھے ہاندے ہی میں بدلت فرمائی تھی کہ مولوی صاحب کا خط پلہ تیرا کے تھانے وار کے حوالے کر دیا جائے، وہ ان کو پہنچا دے گا۔ اتفاقاً دن ڈھلے، بلکہ رات پڑے میں پلہ تیرا کی کارواں سراسے میں بیل گاڑی اور راہ کے پھڑے چوں کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ تھانے وار بھی کارواں سراسے میں آ پہنچا اور پھر اُدھر چل دی کرنے لگا۔ میں نے ارماں خط کے ہاندے میں اس کی مدد چاہی۔ اگرچہ اس نے میری گزارش مان لی، تاہم انتہائی بد تفسیر ہی کے ساتھ۔ چنانچہ دل نہ مانا اور طویعت کو گوارا نہ ہوا کہ خط اسے دوں۔ ویش پر ایک طیر معروف مسافر نے جب آپ کا اسم گرامی سنا تو جبراً مجھ سے خط ملا۔ وہی چند سطریں، جو اندھیرے میں جلدی جلدی لکھی تھیں، میں نے اس کے حوالے کر دیں۔ اتفاقاً آپ کی نظر سے گزریں گی، لیکن یہ عیوض نامہ، کہ گاڑی بان کے ہاتھ بیچ رہا ہوں، اگر نہ پہنچا تو اس گناہ کار کے گلے پہنچنے پر ملے گا، کیوں کہ اس سے کم عرصے میں اس کا پہنچا ممکن نہیں۔ واپس ملے گی شہر۔

تھانے وار نے یہ ہے کہ کچھ آسمان کے ظلم سے تنگ آ کر میں نے اپنے آپ کو سپردِ دریا کر دیا، یعنی اسی جگہ سے کشتی کرانے پر لے کر اور آدی اور مارا سلاخی سفر اس میں ٹھونس ٹھونس کر "بسم اللہ بحرِ ہوا و مرُئیا" پڑھ کر کشتی دریا سے جہاں میں ڈال دی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ بنارس میں قیام کرنے کے بجائے اللہ آباد پہنچ کر چند دن آرام کر کے اور ضروریات سفر بہم کر کے سفر پر روانہ ہو جاؤں اور شمال کے مرشد آہو کے سوا کسی جگہ قیام نہ کروں۔ دریا کے سفر کا حال بھی دو تین دن تک معلوم ہو جائے گا۔ کشتی بان کہتے ہیں کہ تین دن کی مدت میں اللہ آباد پہنچ جائیں گے۔ دیکھا جائے گا۔ آخر کار بدھ کے روز، دوپہر کے قریب، ناخدا کی جگہ خدا پر بروسا کر کے میں کشتی میں سوار ہو ہی گیا۔

جناب مولوی صاحب قبلہ و کعبہ، بد نظیر اعلیٰ!

ایک عرصہ ہو گیا ہے کہ میری سائنس اُس قبلہ راستوں کے فراق کی تپش میں شعلہ طیز اور جبین اس آستانہ کی ہوس میں سجدہ ریز ہے۔ افسوس، کہ میرے اور اس پانی کے درمیان، جس سے شوق کی خطرناک آگ بجائی جاسکتی ہے، سات دریا حائل ہیں اور اس درگاہ کا وہ سحر، جسے اس کی عہدیت کی نماز کی مہر قرار دیا جاسکتا ہے، کبجے بٹنا دور ہے۔ آپ نے میری بنارس کی خاک فیضی کے دوران خط تحریر فرما کر جس شفقت کا اظہار کیا تھا۔ اس نے میری قسمت کو ایک روشنی اور طلوعِ چشم کو ایک بلندی صلا کر دی تھی۔ اس کے جواب کی ترقیم کی سعادت کو وقت کی مین جملہ مستحیات میں سے سجدہ کر لوں ایک ورق آپ کے خدام ذی احترام کی خدمت میں لکھ کر (اس لہوی نے) خشکی کے راسخے عظیم آپلو کے سفر کا ارادہ کیا۔ مختصر یہ کہ ہزگوں کی سالوں کی توجہ کی برکتوں سے گرد کی طرح، کہ ہوا کے پہلوں پر لڑتی ہے، ہر گام پر کانٹے اور پتھر کی تلواروں کی دھاروں سے ٹکراتا، کبھی راتوں کی سردی کی شدت سے پریشان ورنہیدہ اور کبھی گردشِ ایام کی الم زدگی سے نالعل، سفل کے دن چوتھی شعبان کو دھڑ سے دن چڑھے (یہ لہوی) گلگتے پہنچا۔ میں اس بے احسان جھانے نینھنے والے کی غرب پدوری پر نڈ کرتا ہوں کہ ایک ایسے شہر میں ایسا مکان، جیسا کہ چاہیے تھا، جس میں ہر قسم کی آسائش موجود ہو، جس کی فضا بھی خاطرِ آرزوگاہ کی طرح وسیع ہو اور جس میں دنیا طلبوں کی حرص کے وہی کی طرح بہت اللہ بھی ہو، ایک گوشِ سمن میں بیٹھے پانی کا کنواں ہو اور پست پر اہل ثروت کے لائق ایک آرام گاہ ہو، بغیر کسی تلاش کے، بنا کسی سے بات کیے، بغیر کسی کے احسان کے، دس روپے ماہ وار کرائے پر مل گیا اور اس طرح انسانوں اور جانوروں، دونوں کے آرام کے لیے ایک ٹھکانا ہو گیا۔ دو روز میں سڑکی کسالت دور کر کے

لور روش فرماں شاہی کو شعلِ مذہب بنا کر بجلی بندر جانے کے قصد سے میں کشتی میں بیٹھ گیا۔  
 نواب علی اکبر خان ملتانہائی کی خطرات کے لطف کے بارے میں اگر یہ بھول کر میری قسمت  
 نے خوبے حیران کر دیا، تو ہا جوگا لور اگر یہ بھول کر مجھے خود اپنے آپ پر شک آنے لگا،  
 تو یہ بھی جائز ہوگا۔ اُس خدا کی، جس نے عقل کو پیدا کیا اور جس نے عقلِ مذہب کا انتخاب کیا،  
 قسم کی کہ کھتا ہوں، اس قدر قیمت لور ان توصات کے دوسرا آدمی سارے بنگال میں نہیں  
 ہوگا۔ اسے خدا، یہ اطلاع تو کسی کان کا ہے لور یہ بیش بساؤد کس خاندان کا ہے؟ چوں کہ پہلی  
 خطرات تھی اس لیے میں نے حاجت روائی لور ہارہ گری کے دوسرے سے انہیں مصلوٰظ رکھا اور دو  
 تین گھنٹے بیٹھ کر اپنے غم کدے پر واہیں آگیا۔ افسوس کہ ان ہی دنوں میں نواب صاحب کو  
 بجلی کے فکٹس کے ساتھ اس زمین پر جو لام بارے کے لیے وقف ہے، اختلاف ہی نہیں،  
 بلکہ جھگڑا و ریش ہے لور وہ اپنی ٹکڑی میں سرگرداں ہیں۔ لہٰذا درخشاں:

ہر دا ماتنی حسرتِ دنیا ویدم  
 چوں بہ حسرت کدہ گبر و مسلمان رفتم

[میں نے سب کو حسرتِ دنیا میں ماتم ہی کرتے دیکھا، جب میں آتش پرستوں لور  
 مسلمانوں کے حسرت کدے میں گیا۔]

(خدا کرے،) نانا آپ کا حکم ماننے والا اور تھکر آپ کی مطیع رہے۔

\*\*\*

۷  
 ۱۸

لز جگرِ حسنہ بہ دریا سرود  
 و ز تنی بے جاں بہ سیکا درود  
 لز طبعِ و بجد بہ خیر سلام  
 و ز لبِ حمود بہ صبا پیام

از دل بہ مرہم سہاس  
و زمی رو جُوسے بہ خضر احساس

لہیا سے جگر سے دریا کے لیے نغمہ، اور سبہاں جسم سے سمکا کے لیے درود  
(بعید از قیاس ہے۔)

اندھیری رات سے سورج کو سلام، اور لٹے اترتے ہوئے ہونٹوں سے شراب کو پیغام  
(بعید از قیاس ہے۔)

ذخمی دل سے مرہم کے لیے اعتبارِ کلندر، اور بھڑے راجتے کے مسکشی کی طرف سے خضر  
کی خدمت میں کوئی عرض داشت (بعید از قیاس ہے۔) [

دواہ پر بھی دس دن ہوا ہو گئے ہیں کہ جنابِ عالی کے گرای نامے کی سیما ہی چشمِ منتظر  
کا سرسبز نہ بنی۔ وہی اللہ کی پہلی تاریخ کی لکھی ہوئی عرض داشت اور یادِ کبر کی آفتابوں تاریخ کا  
لکھا ہوا خط، کہ تھوڑی مولوی ولادت حسن صاحب کے خط ہی میں ملفوف تھا، کس طرح کموں کہ  
تحت ہو گیا اور آپ کی ربوبیت کا اثر رکھنے والی نظر سے نہیں گزرا۔ کاش، میں تھامل کا نقش  
جنابِ عالی کے التفات کے واسطے پر بنا سکتا تاکہ دل کو پریشانی سے رہائی ملے۔ ایک دن  
کثرتِ اضطراب سے برادرِ مہدوی مولوی ولادت حسن صاحب کی خدمت میں دوڑا ہوا گیا  
جب خط کے پہنچنے کے بارے میں تحقیق کی گئی تو ظاہر ہوا کہ ہجوم کو بھی اس کا انتظار ہے۔  
اگرچہ آپ کے حالات سے لاطین کے درد کو دوا نہ ملی، لیکن خدا کا شکر ہا لایا ہوتا ہے کہ اس نے  
مجھے رکھک کی تپش کے دوزخ کے وارغ سے نہیں جلا دیا۔ قصہ مختصر، جو کچھ بھی گزرا تھا، ان  
دونوں خطوط میں اس اختصار کے ساتھ جو تفصیل پر حاوی ہے، آپ کی جہان آرا اسے پر  
عرض کر دی گئی۔ تازہ خبر یہ ہے کہ عرض داشت کو فٹل میں پہنچ گئی اور حکم یہ ہوا کہ قانون  
کا تقاضا یہ ہے کہ نغمہِ ظلم پہلے ریڈیٹنٹِ دہلی کے گوش گزار کیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ  
میں سر کی استطاعت اور واپسی کی تاب و توان نہیں رکھتا۔ مجھے حکم ملا کہ (ذخمی) ہمیں رہے  
اور وکیل کے ذریعے ریڈیٹنٹِ دہلی سے رجوع کرے۔ میں نے رفیقانِ وطن میں سے ایک کو

ایک خط لکھا اور دو چاہی۔ اس نے غریب نوازی کی اور اس کام پر مگر بستہ ہو گیا اور میرے لیے ایک وکیل کیا اور (اس کی) جگہ اطلع دے دی۔ میں نے وکالت نامہ وکیل کے نام لکھ کر اور وہ تمام کاغذات، جو سمجھنے ضروری تھے، اس کے ساتھ اس خط میں رکھ کر اس مستعد دوست کو جو مجھ پر مجھ سے زیادہ مہربان ہے اور اس کار سازی اور انصاف طلبی میں مجھ سے زیادہ ہار یک جہن ہے، دینی بھیج دیے ہیں:

تا در میانہ خواستہ کردگار پیست!

[اب دیکھیے، خدا کی مرضی کیا ہے!]

اللہ بس، ماسوا ہوں!

...

۸  
—  
۲۱

قبلہ گا، بے کساں بننا!

رحمت الہی کے حیران کن آثار میں سے (و) ہے کہ گلگتے کی آب و ہوا مجھے ماس آگئی ہے۔ اس جگہ میں اپنے وطن کے مقابلے میں زیادہ آرام سے ہوں:

ہر پردہ زندگی نواسے دارو

ہر گوشہ از دہر فضاے دارو

برچید بیست از دافغم یکسر

بگلہ گلگت آب و ہواے دارو

[زندگی کے ہر پردے میں ایک آہنگ ہوتا ہے۔ زمانے کے ہر گوشے میں ایک

انصاف ہوتی ہے۔

میرے دماغ کی مادی بیست (خلی) انجی کر لال دی۔ بگلہ کی عجیب آب و ہوا ہے۔]

اسٹنٹ سیکرٹری سیمین فریڈ کو میں نے دریافت کیا۔ بریسی اچھی ملاقات ہوئی۔  
 باقاعدہ استقبال کے لیے اٹھے، رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئے، گلے ملے اور  
 عطر و پان بھی پیش کیا۔ اس پسندیدہ خصلت کی طرز ملاقات نے مجھے مسرت اور میرے دل کو  
 توانائی بخشی ہے۔ نواب گورنر جنرل بہادر کے نام کی درخواست اس عدالت کے قانون کے  
 مطابق سیکرٹری بہادر کے سپرد کر دی گئی۔ اسی ملاقات میں سیکرٹری بہادر نے اس کو پاشی  
 صاحب کے حوالے کر دیا کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کریں۔ یہاں ایک اور افسر ہیں، بہت  
 مدبر و مستعد، جن کا نام رینڈریو اسٹرلنگ ہے۔ یہ کونسل کے قوس عروجی کے لیے نقطہ  
 بہارست اور قومی نزولی کے لیے نقطہ آخر ہیں۔ چوں کہ صاحب طعم و عرفاں ہیں، سخی سخی اور  
 سخی فہم ہیں، میں نے ان کی مدح میں چھپیں اشعار کا ایک قصیدہ کہا ہے۔ قصیدے کے آخر  
 میں کچھ اپنا حال بھی لکھا ہے۔ کسی کوشش سے نہیں، محض اتفاق تھا کہ ان کی خدمت میں  
 بڑے اچھے اور پسندیدہ طریقے سے حاضری کا موقع مل گیا۔ انھوں نے میری بری عزت افزائی  
 قربانی اور مجھے میری کام بانی کا یقین دلایا۔ میں نے قصیدہ ان کی خدمت میں پیش کیا اور اس  
 کا کچھ خضر پڑھ کر بھی سنایا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور میری دل جوئی کی اور اعانت کا وعدہ  
 کیا۔ آپ پر یہ امر بھی واضح کر دوں کہ رینڈریو اسٹرلنگ صاحب چیت سیکرٹری کے عہدے  
 پر فائز ہیں اور میں جملہ کارکنان کو نسل شمار کیے جاتے ہیں اور فریڈ صاحب اس واوگر مائل کے  
 پیش کار و ماتحت ہیں۔ جب دو تین مقدمے کو نسل کے لیے جمع ہو جاتے ہیں اور وہ  
 (اسٹرلنگ صاحب) موقع عمل کے مطابق ہر مذمتی کو اپنے سامنے بلا کر اور ہر ایک کے نفسی  
 مقدمہ پر حاضر خواہ طور کر کے قابل سماعت مقدمات کو ناقابل سماعت سے چھانٹ لیتے  
 ہیں۔ ان میں سے ناقابل سماعت مقدمات درخواست گزاروں کو واپس مل جاتے ہیں اور  
 قابل سماعت کو نسل کو پیش کر دیے جاتے ہیں۔ بارے، میں اس بات پر خوش ہوں کہ میرا  
 عرضی دعوامقابل اور لائق سماعت کو نسل گردانا گیا۔ (دیکھا جاسیے کہ) اب اس بارے میں  
 کیا پیش ہوتا ہے اور حاکموں کا میرے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔

زیادہ حد تک

قبلہ گا!۱

مرضی قلیلیات کے بعد جو بات کہنے کی ہے، تو وہ یہ کہ آپ کے گراہی نامے کا ہما میرے سر پر سا یہ لگن ہوا اور اس نے مجھے شادمانی کی سلطنت کا بادشاہ بنا دیا۔ کیا کہتے، آپ کے امت ناموں کی غمی کی روانی کے، جس نے وسوسے کے ظہر کو بٹھا کر دل کو اس آباد جمیعت میں پہنچا دیا! خدا کی قسم، یہ عبودیت نامہ لکھتے وقت فوقی حضور ہی میرے دل میں جوش مارتا ہے (اور) ہرگز اکتب و آداب کی گنجائش نہیں رہتی۔ چل کر میں جا رہا ہوں کہ قرر بات سے سر نہ کھم نہ ہو۔ ہر حال، اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ بیان سبب ربط ہو جاتا ہے۔ مجھے نہ مضمون کی تھرم و تاثیر کا خیال ہوتا ہے اور نہ درازی سخی کی فکر ہوتی ہے۔ میں تو گفت گو کی ولوی کے لٹھب و فراز مستانہ طے کرتا ہوں اور بگٹھ چلتا ہوں۔ اب دل میں صرف یہ عش ہے کہ میرا احوال قبلہ گا ہی کی راے مثل کتا سے پوشیدہ نہ رہے۔ اس سے دو ہفتے پیش تر، جمرات کے روز، صبح کے وقت، جناب مولوی سید صبیح صاحب تھریف لے آئے اور مجھ سے اظہار رخصت لینے لگے۔ (کہتے تھے) میں رایتے میں ہوں اور دور سے پرہا رہا ہوں، ستر کا ارادہ ہے۔ میں نے دو لڑے تک جا کر انھیں رخصت کیا اور خدا کے سپرد کیا۔

دوسرے یہ کہ ان ہی دنوں میں ایک خط دہلی سے آیا اور کاشف اس احوال کا ہوا کہ میرے بچے ہونے کا خدات مل گئے اور میرے کارکن دوست نے انھیں قبول کر کے وکالت نامہ وکیل کے حوالے کر دیا۔ ابھی ان کی وکالت قبول سے طبل تک نہیں پہنچی تھی کہ روشن الدولہ سر ایڈووڈ کو لبرک صاحب بہادر فرماں روا سے دہلی نے دورے کے انداز میں

روانگی کے ہر کھولے لامحالہ اب ان کی واپسی کا انتظار ورنہ پیش اور یہ تاخیر، کہ سبوجہ درمیان آگئی، لہٰذا جگہ ہے۔ اس شہر کی دوسری خبروں میں سے ایک یہ ہے کہ ولیم بیل، کہ اور اکیس کو نسل کے سب سے اعلیٰ کن ہیں اور حسبِ سابق وائس پرنسپل ڈیوڈ ولیم کونڈیش بینک، کہ تامل منصبِ گورنری پر مامور ہیں، والد سے کی طرف، جو گلشن کے مشرق میں ایک شہر گاہ ہے، سیر و شمار کے لیے سدھارے میں (اور) نیک لوصاف کے مالک غلامی لوار سے کے سیرنٹی مولوی عبد الکریم آٹھارہ کی رخصت پر دریا کے راستے نکھوڑواتہ چو گئے ہیں۔ ممکن ہے، اس وقت تک عظیم آباد پہنچ چکے ہوں۔

عجیب خبروں میں سے ایک یہ ہے کہ اس جگہ کے شعرا اور نکتہ دانوں نے اس خاکسار کے درود کے بعد ایک بریم سنی سہائی تھی۔ براگریری جینے کی پہلی اتوار کو سرکار کھپنی کے در سے میں شراب جمع ہوتے اور اردو اور غلامی کی غزلیں سناتے۔ ناگاہ ایک گراں قدر شخص بھی، جو ہرات سے سعادت پر آیا ہوا ہے، اس انجمن میں پہنچتا ہے اور میر سے اشعار سن کر بلند آواز سے تعریف کرتا ہے اور اس ہلرو کے نغز گو شراب کے کلام پر صرف عینم زربہ پر اکٹھا کرتا ہے۔ چوں کہ طبعیتیں بالذات خود نمائی پر مرقی ہیں، ساتھی بھی حسد کرنے لگتے ہیں اور اس محفل کے حمایتی اور اس فن کے ناقدین میر سے دو اشعار پر غلط اعتراضات کر کے اس کی تفسیر کرتے ہیں اور اس سے پیش تر کہ زبان جواب سے آشنا ہیں، ممدوی نواب علی اکبر خان اور لائٹ عزت و الامت مولوی محمد حسین صاحب جیسے دانش و دلوں سے جواب پا کر جہاگ کی طرح دھڑھکتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں بزرگ حضرات کے حکم کے مطابق میں نے ایک شہنوی کہی ہے جس میں اپنے مجنوں انکسار کے اظہار کے بعد میں نے ان کے اعتراضات کے جواب ان اشعار میں دیے ہیں اور اس شہنوی کو دنیا نے پسند کیا ہے۔ ان شاء اللہ العظیم، جناب عالی کی خدمت میں اس خط کے بعد جو خط ارسال ہوگا، اس میں ان اشعار میں سے ایک ورق (ضرور) منسلک ہوگا۔



حضرت قبلہ گاہی اور اپنے ولی نعمت کے، خدا ان کا بلند سایہ ہمیشہ قائم رکھے، سر پر قربان ہو جاؤں اور اپنی جان اُس خاکِ پا پر پھلور کر دوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کیا عرض کروں، کون سی قریر کے پردے سے سر نکالوں۔ نہ ہی آپ کی یاد آوری کی احسان مندی کو کنارہ لٹا ہے اور نہ ہی آپ ہر افزائی کا ٹکڑہ قریر میں آنے کے لائق (ہے)۔ پرسوں جناب منشی علی خاں بہادر نے مجھے ایک مکتوب بھیجا۔ اب جو لٹاؤ کھولا تو اس پردے سے ایک نور چمکا۔ جب میں سمجھ گیا تو وہ جناب عالی کے خط کے آثار تھے جو خانہ ممدوح کو اس شت عہد کی ماجری کی آگاہی کے لیے لکھا تھا۔ عرض یہ کہ ان کے ملازموں نے اس تنگ آؤریش کو کھٹا گیا تھا کہ کوئی وقت مقرر کر کے مجھے اطلاع دو تاکہ تمہارا سر آسمان سے بھی بلند کر دوں اور اپنے درود کا نور تمہارے غلت کہ سے پر ڈالوں۔ میں نے جواب سے معذرت کر لی اور دوسرے دن خود ہم بوسی کے لیے گیا۔ جناب ممدوح اہل وحدت الوجود کے مذاقی کے مطابق بات کرتے ہیں اور اسی باعث ٹاٹ کی ٹوٹی اور ٹھٹھتے ہیں۔ شمع و چراغ انجمن مولوی سید ولایت حسن کے طرز سلوک کا اور معنی آشنائی کے آسمان کے سوج لوہاب علی اکبر خان طباطبائی کے ملازموں کے حسن اخلاق کا احسان تو میرے دل و جان پر تھا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کی صحبت سے میں نے ہر قسم کا اکتساب فیض کیا تھا اور وہ بھی ”ہذا میں برکت البرکۃ“ نوک زبان پر تھا۔ اب تو عزت میں مزید اضافہ ہو گیا اور ایک نئی شان پیدا ہو گئی۔ خدا کی قسم، اگر میں اس آوارگی کے چکر میں آپ کے پاس نہ پہنچتا تو میری خوشگلی کے لیے مرہم اور کھسکی کے لیے موسیقی کہاں سے ملتی۔ اگر انصاف کی ٹور ہاتھ سے نہ چھوڑوں تو میں چاہتا ہوں کہ میرا کرم علی کے احسان سے عمدہ بر آہونا، کہ انھیں نے مجھے اُس آستانے کا خاک کاراستہ دکھا یا اور اس منزل کے لیے میرے واسطے خضر راہ ہی گئے، میرے بس کا نہیں۔ سو بھوان کے ملازموں

کی طرح سیرے لیے کہاں ممکن! ہرگز نہیں! ہرگز نہیں!  
خاموشی از ثنائے تو حید ثنائے کس

[تیری حریت میں خاموشی ہی تیری انسانی حریت ہے۔]

خفی نہ رہے کہ یہ خط شہان کی بھٹی تاریخ کو لکھ کر اسی دن میر صاحب علی خان کے  
ذریعے لاہ کابلی مل کو بھیجا گیا۔ خدا (انہیں اس خط کو) اپنے خط کے ساتھ ملفوف کر کے  
ہاندے بھیجنے کی توفیق عطا کرے۔

\* \* \*

## ضمیمہ: ۲

زیر نظر مجموعے اور "بیج آبنگ" میں ۵۸۱ دو خط ایسے ہیں جن کے متون میں بعض اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان اختلافات کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔ "بیج آبنگ" کا لغو مطبوعہ پنہاں یونیورسٹی پشاور نظر رکھا گیا ہے۔ اس کے لیے لفظ "مطبوعہ" استعمال نہ کیا گیا ہے۔

$$\frac{۲}{۲}$$

- ۱۔ "مطبوعہ" میں لفظ "وجود" نہیں ہے۔
- ۲۔ "مراجم" کی جگہ "مطبوعہ" میں "مراجم" ہے۔
- ۳۔ "حصولی مدعا" کی جگہ "مطبوعہ" میں "تقریبہ کامیابی" ہے۔
- ۴۔ "سی سازو" کی جگہ "مطبوعہ" میں "سی شمارو" ہے۔
- ۵۔ "مودہ" کی جگہ "مطبوعہ" میں "مودہ" لکھا ہے۔
- ۶۔ "رسید" کی جگہ "مطبوعہ" میں "رسیدہ" لکھا ہے۔
- ۷۔ "سر خٹہ" کی جگہ "مطبوعہ" میں "سر خٹہ در چلہ تارارسید" لکھا ہے، جو بظاہر غلط ہے۔ دو خٹہ کی رات کسی گاؤں میں گزر کر لڑنا سر خٹہ ہی کو چلہ تارارسید ہوں گے۔

- ۸۔ "دربست است" کی جگہ "مطبوعہ" میں "دربست" لکھا ہے۔
- ۹۔ "فاطرِ عالم" کی جگہ "مطبوعہ" میں صرف "فاطر" لکھا ہے۔
- ۱۰۔ "بودہ" کی جگہ "مطبوعہ" میں "رسیدہ" ہے۔
- ۱۱۔ "خواہد شد" کی جگہ "مطبوعہ" میں "کردہ خواہد شد" ہے۔

\* \* \*

۳۱

۳۲

- ۱۔ "قبیلہٴ مہمانِ آفاقِ سلامت" کی جگہ "مطبوعہ" میں "قبیلہٴ ہندوستانِ سلامت" ہے۔
- ۲۔ "افشارِ شوق" کی جگہ "مطبوعہ" میں "فسیحِ شوق" ہے۔
- ۳۔ "ہایہٴ غمت" کی جگہ "مطبوعہ" میں "گویم" ہے۔
- ۴۔ "تو اس نوشت" کی جگہ "مطبوعہ" میں "نولیم" ہے۔
- ۵۔ "مطبوعہ" میں "عمودیت نامہ" کے بعد "را" بھی ہے۔
- ۶۔ "سلام روستائی" کی جگہ "مطبوعہ" میں "سلام روستائی" لکھا ہے۔
- ۷۔ "دارو" کی جگہ "مطبوعہ" میں "است" ہے۔
- ۸۔ "مطبوعہ" میں "حرفش" کی بعد "را" بھی ہے۔
- ۹۔ "خودِ پشواں" کی جگہ "مطبوعہ" میں "خودِ قدسی" لکھا ہے۔
- ۱۰۔ "خداوندِ نعمت" کی جگہ "ولیِ نعمت" لکھا ہے۔
- ۱۱۔ "تشیخ" کی جگہ "مطبوعہ" میں "برخورداری" لکھا ہے۔
- ۱۲۔ "افسرہ ہی ساقی" کی جگہ "مطبوعہ" میں "افسرہ ہی ساقی" لکھا ہے۔
- ۱۳۔ "آں شرافشاں دلمانِ نگاہ واریں بفرقِ درویشاں ہواخواہ" کی جگہ "مطبوعہ" میں "آں ہ آرا نشہ دلمانِ نگاہ واریں بفرقِ غالب ہواخواہ" لکھا ہے۔

\* \* \*

## ضمیمہ: ۳

زیرِ نظر مجموعے میں شہنوی "بادِ مخالف" اور فرانسس ہاکنس کا قصیدہ شامل ہے۔ کھیاتِ غالب (فارسی)، شائع کردہ مجلسِ یادگارِ غالب، پنہاب یونیورسٹی، لاہور، میں شامل ان منقولات کا مقابلہ کیا گیا تو متحذہ اختلافات سامنے آئے۔ ذیل میں ان اختلافات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ مذکورہ کھیاتِ غالب کے لیے لفظ "کھیات" استعمال کیا گیا ہے۔

اشعار کے الفاظ کے سلسلے میں یاے بھول (ہے) اور یاے معروف (ہی)، نیز نولہ حرف (ن) اور نولہ باطلان (ان) کے فرق کو ملحوظ رکھنا گیا ہے۔

## بادِ مخالف (آہستی نامہ)

شعر ۱۱۳ "دردِ غم و بیچِ غم سرگزشتہ" کی جگہ "کھیات" میں "دردِ غم و بیچِ غم سرگزشتہ"

ہے۔

شعر ۱۱۴:

میںماں را نوازشِ رسم است

کار او نیکِ راضی رسم است

”کفیات“ میں یہ شعر اسی طرح ہے:

کارِ احبابِ ساقی رسم است  
میںماں را لواحقِ رسم است

شعر ۱۸: ”بہر رسم کارستانی“ کی جگہ ”کفیات“ میں ”زود رسم کارستانی“ ہے۔

شعر ۱۹: ”برق بے تائی جہاں زود“ کی جگہ ”کفیات“ میں ”برق بے طاقتی جہاں زود“

ہے۔

شعر ۲۰: ”کفیات“ میں پہلا مصرع یوں ہے:

وہ آگاہی فنا زود

شعر ۲۱: ”کفیات“ میں یہ شعر نہیں ہے۔

شعر ۲۲: غالب کاتب کی غلطی سے شعر خط لکھا گیا ہے۔ ”کفیات“ میں یہ شعر یوں ہے:

ہاں میں ایں خشم و کین، درخج درخج!

میں چہاں، تاں چہیں، درخج درخج!

شعر ۲۳: ”گوند“ کی جگہ ”کفیات“ میں ”گوند“ ہے۔

شعر ۲۴:

بیش را بیشتر کہ گفت کہ گفت

بہ ز میں بیشتر کہ گفت کہ گفت

”کفیات“ میں دونوں مصرعوں کے آخر میں ”کہ گفت“ کی جگہ ”میں“ ہے۔

شعر ۲۵: دوسرے مصرع میں ”آنہ غالب“ کی جگہ ”کفیات“ میں ”ہر چ غالب“

ہے۔

شعر ۲۶: دوسرا مصرع ”تا نہ شہد دُوسیا ہی میں“ کاتب کی غلطی سے جےوزن ہو گیا

ہے۔ یہ مصرع ”کفیات“ میں یوں ہے:

جاں نہ شہید دُوسیا ہی میں

لوری ہی صحیح ہے۔

شعر ۳۸ کے بعد "کلمات" میں یہ شعر ہے:

تا جودہ دل ز بے بگری  
بعض آدم ز خیرہ قری

یہ زید نظر مجموعے میں نہیں ہے۔

شعر ۵۰ کے دونوں مصرعوں میں "کروم" کی جگہ "کلمات" میں "دارم" ہے۔

شعر ۶۰: "کلمات" میں یہ شعر نہیں ہے:

دین دعویٰ نہ بر فروختے  
بے سخن بہم شیخ سوختے

شعر ۶۵: "کلمات" میں پہلا مصرع اس طرح ہے:

واسے با آنگہ شیر من صاف است

شعر ۷۰: زید نظر مجموعے میں اس شعر کی جگہ ٹھوٹی ہوئی ہے، "کلمات" میں یہ شعر

موجود ہے:

لیک در بعض جا، نہ در ہر اش

لفظ "مارے ہوئے" است ترجمہ اش

شعر ۷۰: "کلمات" میں دوسرے مصرع میں "بدبناں" کی جگہ "بدبناں" ہے

شعر ۷۰: زید نظر مجموعے میں دوسرے مصرع میں "تھ سے ماشے" کی جگہ "تھ چ آرزو"

ہے۔ اس شعر کے بعد "کلمات" میں یہ شعر ہے:

لوٹش خود مصاف مقبوب است

دو بیس تا کدام اسلوب است

یہ جو زید نظر مجموعے میں نہیں ہے۔

شر ۸۰ کے بعد "نکلیات" ہیں:

مگر ایسی شعر زائل نقط نہ ہو  
وہ ہو شعر میں عطف نہ ہو

زیر نظر مجموعے میں یہ شعر نہیں۔

شر ۸۱: زیر نظر مجموعے میں اس شعر کا صرف دوسرا مصرع ہے۔ "نکلیات" میں یہ پورا شعر نہیں ہے۔

شر ۸۲: دونوں مصرعوں میں "نکلیات" میں "گرد" کی جگہ "ہاشد" ہے۔

شر ۸۸ کے بعد "نکلیات" میں یہ شعر بھی ہے جو زیر نظر مجموعے میں نہیں ہے:

ودعہ غاشی ز یادم رفت  
شیوہ عز از نہلوم رفت

شر ۱۰۱: پہلے مصرعے میں "نکلیات" میں "آں از آں دم" کی جگہ "آہ از آں دم"

ہے

شر ۱۱۱ کے بعد "نکلیات" میں یہ شعر ہے جو زیر نظر مجموعے میں نہیں ہے:

دلم بدای کس چرا ہاشم؟  
میں ہمایم، گسں چرا ہاشم!

شر ۱۱۶: دوسرا مصرعہ "نکلیات" میں اس طرح ہے:

ہم برین حمد و راسے و پیمانند

شر ۱۱۸: "نکلیات" میں دوسرا مصرع اس طرح ہے:

گفتہ اش استخوان را لمسزد

شر ۱۲۲: "نکلیات" میں "سی روم" کی جگہ "سی روم" ہے۔

شر ۱۲۵: "نکلیات" میں دوسرا مصرع اس طرح ہے:

آں بہ ہادو دے بہ دہر سر



شر ۱۱۲۶: "نکلیات" میں دوسرے مصرع میں "صنیر" کی جگہ "صنیر" ہے۔

شر ۱۱۲۷: "نکلیات" میں دوسرے مصرعے میں "صائب" کی جگہ "طاب" ہے۔

شر ۱۱۲۸: "نکلیات" میں نہیں ہے۔

شر ۱۳۰ کے بعد "نکلیات" میں شر ۱۳۳ آتا ہے، اس کے بعد شر ۱۳۲ اور پھر

شر ۱۳۱ آتا ہے۔

شر ۱۱۳۳: "نکلیات" میں اس شر کا نمبر ۱۳۱ ہے اور اس کے دونوں مصرعوں میں

"او" کی جگہ "اوست" ہے۔

شر ۱۳۳ کے بعد "نکلیات" میں مندرجہ ذیل شر بھی ہے جو زیرِ نظر مجموعے میں نہیں

ہے:

آں کر طے کردہ ایں مواہف را

چہ شناسد قاتل و واقف را

شر ۱۳۵ کے بعد "نکلیات" میں مندرجہ ذیل شر بھی ہے جو زیرِ نظر مجموعے میں نہیں

ہے:

دل و جانم ہدائے احباب است

شوق و کھفِ رمنائے احباب است

شر ۱۱۳: "نکلیات" میں پہلا مصرع اسی صورت میں ہے:

تا نماند ز من دگر کھف

شر ۱۳۵ کے بعد "نکلیات" میں مندرجہ ذیل اشعار بھی ہیں جو زیرِ نظر مجموعے میں نہیں

ہیں:

بادشاہے کہ در قلمرو حوت

کردہ لہاؤ نکستہ ہائے گلگون

جس ہندوی فارسی دانش  
ہندیاں، سر پہ خطِ فرانس  
شعر ۱۱۳۶: "نکلیات" میں نہیں ہے۔

\*\*\*

## قصیدہ فرانس ہاکنس

جو بعد میں سر ہارلس مٹاف کو پیش کیا گیا۔

شعر ۱: "نکلیات" میں دوسرا مصرع اس طرح ہے:

بد گلکش بدیں حسنی خدا ساز بناز

شعر ۲: "نکلیات" میں پہلا مصرع اس طرح ہے:

گردِ سرِ گدومت اسے جتھ کہ گردِ رہِ قست

شعر ۳: "نکلیات" میں دوسرا مصرع اس طرح ہے:

تیر گلکش نقشبِ قدمِ ظاہرِ ناز

شعر ۴: زیرِ نظر مجموعے میں پہلا مصرع مکمل نہیں ہے۔ صرف یہ الفاظ ہیں:۔۔۔ بر خیالی

ہمیں کوئے کو

"نکلیات" میں یہ مصرع اس طرح ہے:

ہارلس مکنتِ فرخندہ شاکل کہ ہدیر

شعر ۵: "نکلیات" میں اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح ہے:

یاو باو آگہ ازین مرطد تا گلکش

شعر ۳۳: "کھیات" میں یہ شعر اس طرح ہے

گر نہ اندیشہ بھلِ تو قوی دل گنفتہ

نالہ سنیٰ مہی لڑ رہا نہ گویا دے باز

شعر ۳۶: "کھیات" "بست سال" کی جگہ "ہفت سال" لکھا ہے۔

شعر ۳۷: "کھیات" میں "دردِ آدابِ نیاز" کی جگہ "بہ آدابِ نیاز" لکھا ہے۔

"کھیات" میں اشعار تیس ویں شعر کے بعد بیس اشعار مزید ہیں جو زیرِ نظر مجموعے میں

نہیں۔

\* \* \*

## شخصیات

زید نظر بموسے کے رتبہ سید اکبر علی ترمذی نے دیا ہے  
 کے حواشی میں متعدد شخصیات کے بارے میں معلومات درج کی ہیں۔  
 ایسے تمام حواشی کو دیا ہے سے الگ کر کے ذیل میں الفبائی ترتیب  
 سے پیش کیا جا رہا ہے۔

بعض شخصیات کے بارے میں "بزم غالب" از عبد الرؤف  
 عروج (کراچی، ۱۹۶۹ء) میں زیادہ معلومات ملتی ہیں۔ ان شخصیات کے  
 حالات "بزم غالب" سے ماخوذ ہیں، نیز چند مزید شخصیات کا احوال  
 بھی "بزم غالب" سے اخذ کیا گیا ہے، جن پر جناب ترمذی نے حواشی  
 نہیں لکھے۔ ایسے تمام حواشی کے آخر میں "بزم غالب" کا حوالہ دیا گیا  
 ہے اور جہاں کوئی حوالہ نہیں ہے، وہ حواشی جناب ترمذی کے نوشتہ  
 ہیں۔ ترمذی و عروج نے جن ماخذ سے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیل  
 یہاں نہیں دی جا رہی۔ ان کے لیے دوبارہ ترمذی اور "بزم غالب"  
 سے رجوع کیا جائے۔

آغا سیر، مستند الدولہ:

ان کا نام سید محمد خان تھا۔ ان کے والد شاہ ترکمان کی لاولہ میں ہونے کے علاوہ اصل  
 کشمیری تھے۔ آغا سیر نے اپنے دور اقتدار کی ابتدا غازی الدین حیدر کے ایام شہزادگی میں ان

کے ہاں پیش دستوں میں طہم ہو کر کی۔ قواب سعادت علی خان کے استقال پر مسند نشینی کا مسئلہ پیدا ہوا تو آغا میر نے غازی الدین حیدر کو برسرِ اقتدار لانے کی کوشش کی اور انگریزوں کو مجبور کیا کہ وہ غازی الدین حیدر کو مسند نشینی تسلیم کر لیں۔ اسی کے عوض ان کو مستعد الدولہ مختار الملک، ضیغم جنگ بہادر کے خطابات اور لودھ کی نیا بت ملی۔ انھوں نے غازی الدین حیدر کو جنگ کے حقے کا ماویٰ بنا کر تمام امور حکومت سے انھیں فاصل کر دیا اور سارے اختیارات خود منجبال لیے۔ غازی الدین حیدر کے استقال پر نصیر الدین حیدر نے جلوس کیا اور جلد ہی آغا میر مستوب ہوئے، لیکن انگریزوں نے ان کو لہنی پناہ میں لے کر کان پور پہنچا دیا، جہاں ۱۸۳۳ء میں ان کا استقال ہوا۔

گھٹنے جاتے ہوئے غالب نے لکھتے میں بھی قیام کیا۔ ان کو امید تھی کہ غازی الدین حیدر سے انھیں معقول رقم مل جائے گی۔ اسی لیے انھوں نے آغا میر کی مدد میں ایک نثر پر صنعتِ تحلیل لکھی اور ایک غزل میں یہ اشعار بھی شامل کر دیے۔

لکھتے آنے کا باعث نہیں کھتا، یعنی

ہو ہی میر و تماشا، سو وہ کرم ہے ہم کو

لائی ہے مستعد الدولہ بہادر کی امید

جاوے رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

اس کے علاوہ انھوں نے آغا میر کی مدد میں ایک سو دس اشعار کا ایک قصیدہ بھی کہا۔

اس قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رقم

ہو ہی زلفِ ترا سلسلہ جنہاں رقم

اس کے باوجود غالب کی آغا میر سے ملاقات نہ ہو سکی، کیوں کہ غالب نے لہنی پذیرائی کی شرط یہ رکھی تھی کہ آغا میر کھڑے ہو کر ان کی پذیرائی کریں گے اور ان کو تھوہار سے سہاگ رکھا جائے گا، لیکن یہ صورتِ حال مستعد الدولہ آغا میر کو قابلِ قبول نہ تھی۔ اس

سے گم پر غالب راضی نہ ہوئے۔

(”برصِ غالب“، ص ۱۳۱)

احمد بخش خان، نواب:

نواب احمد بخش خان مرزا حارث خان کے بیٹے اور نبی بخش خان، الٰہی بخش خان اور محمد علی خان کے بڑے بھائی تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۷۶۵ء اور مقام ولادت ایک ہے۔ ان کا جوانی کا زمانہ دہلی ہی میں گزرا۔ انھوں نے گوالیار جا کر مہاراجا کی فوج میں خدمت کر لی، بعد ازاں ریاست الود کے مہاراجا بختاور سنگھ نے انھیں عہدہ رکھ لیا۔ جب انگریزوں نے جونا کی جانب ریاست الود کے بعض حصوں پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تو مہاراجا بختاور سنگھ نے نواب احمد بخش خان کو اپنا وکیل بنا کر ہڈ ڈھک کی خدمت میں بھیجا۔ نتیجتاً انگریزوں اور ریاست کے درمیان ایک عہد نامہ طے پا گیا۔

جب ۱۸۰۱ء میں انگریزوں نے ریاست بھرت پور کے قلعہ ڈھنگ پر چڑھائی کی تو مہاراجا بختاور سنگھ نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس سبب میں نواب احمد بخش خان مہاراجا الود کی فوجوں کے ساتھ بھرت پور پہنچ گئے اور جنرل فریزر کو برہمی بہادری کے ساتھ دشمنوں کے نرے سے نکالا، لیکن فریزر بری طرح زخمی ہوا، تاہم اس نے مرنے سے پہلے نواب احمد بخش خان کو سندِ خوشنودی لکھ کر دی، جس پر ہڈ ڈھک نے فیروز پور بھر کا اور اس کے کچھ نواسی ملے نواب احمد بخش خان کو اعزاز کی جاگیر کے طور پر دے دیے۔ پھر مہاراجا بختاور سنگھ نے ان کی بہادری کے اعتراف کے طور پر لوہارو کی جاگیر ان کو عطا کی اور اس طرح احمد بخش خان بیک وقت فیروز پور بھر کا اور لوہارو کے رئیس ہو گئے۔

نواب احمد بخش خان کی دو بیویاں تھیں، ایک سیواقی الاصل اور ایک ان کی لونبی ہم قوم۔ پہلی کے بطن سے نواب شمس الدین خان اور ابراہیم خان تھے، جب کہ دوسری کے بطن سے نواب امین الدین خان اور ضیاء الدین خان پیدا ہوئے۔ نواب احمد بخش خان نے

اپنی زندگی ہی میں مبارکباد اور سرکاری انگریزی کی مرضی سے فیروزپور بھر کے کی ریاست  
نواب شمس الدین خان کے نام اور ریاست لوہارو امین الدین خان اور ضیاء الدین خان کے نام  
کردی اور تمام جاگیر کے انتظامی امور سے دست بردار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اس واقعے  
کے ایک سال بعد اکتوبر ۱۸۸۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ درگاہ حضرت خواجہ بھتیار کاکا کے  
اماطے میں دفن ہوئے۔

(”بزم غالب“، ص-۱۰)

### اسٹرلنگ، لینڈریو (Andrew Stirling):

یہ آئی سی ایس تھا۔ ۱۸۱۱ء میں بہ حیثیت مٹی ہندوستان آیا۔ حکم مارچ ۱۸۴۳ء کو  
گورنمنٹ کے پرنسپل سیکرٹری اور پرنسپل ڈپارٹمنٹ کے ڈپٹی سیکرٹری کا عہدہ سنبھالا۔  
۶ جولائی ۱۸۴۶ء کو گورنر جنرل کا پرنسپل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ اپنی موت  
تک مشغول رہا۔ اس کی وفات گلشن میں ۲۳ مئی ۱۸۳۰ء کو ہوئی۔

لینڈریو اسٹرلنگ کو بعض وجوہ سے اگر غالب کا مرنے و مسمیٰ مانا جائے تو غلط نہ ہوگا۔  
غالب جب ۱۸۴۷ء میں اپنے مہذبے کے سلسلے میں گلشن پہنچے تو اس سے ان کی ملاقات ہوئی۔  
اس نے غالب کے ساتھ نہایت صبر و تحمل سے برتاؤ کیا۔ اس بنا پر غالب کو قریب ہو گئی کہ ان کے  
مہذبے کا فیصلہ ان کے حق میں ہو جائے گا، لیکن یہ امید بوری نہ ہو سکی اور اسٹرلنگ کا  
لہانک ۳۵، ۳۶ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

لینڈریو اسٹرلنگ فارسی زبان و ادب کا بڑا اچھا فوٹو رکھتا تھا۔ غالب نے اس کی مدد  
میں جو قصیدہ کہا ہے وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

فغان کہ نیست سرو درگہ دامن لطافتی

بہ بنو خویش فرو مانده ام ز مریدی

اس کی اہانک موت پر غالب نے بڑا دردناک مرثیہ لکھا:

فروغِ طلحہ ایامِ مسرِ استرگ  
کہ فرِ خسرویش یافتی چو خود ز جبین  
گلگشتِ رُوسے و پسندیدہ خُوسے و مشکبیں سُو  
ہر اسے نیک و ہر گوہر خوش و ہر شیوہ گزین

("برمِ غالب"، ص ۲۹)

## افضل بیگ، مرزا:

مرزا افضل، مرزا جیون بیگ برلاس کے بیٹے اور امیرالنسا بیگم کے بھائی تھے۔ امیرالنسا بیگم کی شاہی خواہہ حاجی سے ہوئی تھی۔ اس شاہی سے ان کے دو لڑکے خواجہ جان اور خواجہ لہان تھے جو خواہہ حاجی کے مرنے کے بعد نصراٹھ بیگ خان کے پاس ماندگان کے طور پر ہزار روپے ہتھی کے وارث ہوئے۔

مرزا افضل بیگ قلعہ سمن میں بہت رسوم رکھتے تھے۔ اکبر شاہ جانی نے ان کو اپنا وکیل بنا کر نور زعفرانی کے پاس گلگتے بھیجے تھے۔ جن دنوں غالب اپنی پیش کی بحالی کے لیے گلگتے پہنچے ہیں تو مرزا افضل بیگ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ غالب کے مقدمے سے چوں کہ ان کے گلے بے جا نہ متاثر ہوئے تھے اصل لیے افضل بیگ نے ان کی حالتِ خسروہ کردی۔ مرزا غالب نے اپنی ناکامیوں کا اصل ذمے دار مرزا افضل بیگ ہی کو قرار دیا۔ یہی مرزا افضل بیگ مرزا فرحت اللہ بیگ کے پردادا تھے۔

("برمِ غالب"، ص ۳۲)



## التفات حسین:

یہ وہی صاحبِ سلوم ہوتے ہیں جنہیں غالب نے ایک خط لکھا ہے۔

## امیر النساء بیگم:

امیر النساء بیگم، مرزا جمیل بیگ برلاس کی بیٹی اور مرزا افضل بیگ کی بہن تھیں۔ خواجہ حاجی ان کے شوہر تھے۔ ان کے بطن سے دو لڑکے شمس الدین عرف خواجہ جان اور بدرالدین عرف خواجہ لمان، خواجہ حاجی کے ورثا میں تھے۔ ان کے ماسوں مرزا افضل بیگ غالب کے گلشنِ بہنچنے سے پہلے وہاں اکبر شاہ ثانی کے وکیل کی حیثیت سے سامور تھے۔

## اودت نرائن سنگھ راجا:

اپنے والد ماجد پ نرائن کے چالیس تھے۔ ۱۳ دسمبر ۱۷۹۵ء کو مکران ہونے اور اپنی موت (۱۸۳۵ء) تک بنارس پر حکومت کی۔

## بیشن، جارج میکسول (George Maxwell Batten):

ایک متشی (کھرک) کی حیثیت سے ۱۸۲۷ء میں ہندوستان آیا۔ اسی سال حکم فروری کو لاہور کے بمسٹرٹ اور گلکٹر کا اسٹنٹ کمونات ہوا۔ ۱۸ فروری ۱۸۲۷ء کو پدیشیں سیکرٹری کا اسٹنٹ بنا دیا گیا۔ اس حیثیت میں وہ ۱۸ نومبر ۱۸۲۹ء تک کام کرتا رہا۔ گلشن میں ۲۱ جولائی ۱۹۳۳ء کو انتقال ہوا۔

بیلی، جان (John Bayley):

دیکھیے: بیلی، ولیم بشرور تھ  
 خطوط میں ولیم بشرور تھ بیلی کا نام غلط (جان بیلی) لکھا گیا ہے۔

بیلی، ولیم بشرور تھ (William Butterworth Bayley):

یہ آئی سی ایس ایس المسر تھا، ایٹن کا فارغ التحصیل تھا اور ۱۷۹۹ء میں ہندوستان آیا۔  
 ۱۸۰۳ء میں گورنر جنرل اور ترجمہ فارسی کے دفتر میں اسٹنٹ کی حیثیت سے عہدہ ہوا۔  
 ۱۸۰۷ء میں الحاق شدہ اور مفتوحہ صوبوں کے کٹسٹر کے دفتر میں فارسی اور ہندوستانی کے  
 مترجم کے عہدے پر مامور ہوا۔ ۱۸۱۹ء میں حکومت کا چیف سیکرٹری مقرر ہوا۔ بدیع سے  
 جولائی ۱۸۲۸ء تک اس نے قائم مقام گورنر جنرل کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

جواد علی بیگ عرف مرزا مغل، مرزا:

مرزا غالب کی بی بی جموٹی خانم کے بیٹے تھے۔ جموٹی خانم کی شادی مرزا اکبر بیگ  
 بدخشان سے ہوئی تھی۔

حاجی، خواجہ:

مرزا رحمت اللہ بیگ نے خواجہ حاجی کو غالب کے جڑا علی ترسم خان کے چھوٹے بھائی  
 ترسم خان کی اولاد میں بتایا ہے۔ غالب کے بیانات اس کے برعکس ہیں۔ انہوں نے خواجہ  
 حاجی کے باپ کو اپنے دواؤں کو خان بیگ خان کا سائیس بتایا ہے۔

خواجہ حاجی کا باپ قوٹاں بیگ خان کے سواروں کے دستے میں سائیس تھا۔ قوٹاں بیگ نے اس کی خدمات کے عوض اپنی بیوی کی بیوہ بیس کی لڑکی کا نکاح اس سے کرا دیا تھا۔ جہاں چہ خواجہ حاجی کا ذکر غالب نے بڑی تصویر سے کیا ہے۔ جب مرزا نصر اللہ بیگ خان کا ہاتھی سے گر کر استحال ہو گیا تو خواجہ حاجی نے ان کے تمام ساز و سامان پر قبضہ کر لیا اور ان کے خیمے، چاول داریوں، ہاتھی گھوڑوں اور شرابی سواروں کو لے کر نواب احمد بخش خان والی قیروند پور جمرہ کی خدمت میں پہنچا جو نصر اللہ بیگ خان کے سالے تھے۔ انھوں نے اس کو اپنے غلاموں میں شامل کر لیا اور انگریزوں کی طرف سے خواجہ حاجی کو مرزا نصر اللہ بیگ خان کے بیس ہاتھ لگان میں شمار کرتے ہوئے پانچ ہزار روپے کی بخشش میں سے دو ہزار روپے دینے شروع کر دیے۔ جب غالب سب سے شہر کو پہنچے تو انھوں نے اس پر تحریری اور زبانی احتجاج کیا۔ جس پر احمد بخش خان عذر معذرت کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان سے غلطی ہو گئی ہے اور وہ لارڈ ڈیک کے سامنے حاجی مرزا کو مرزا نصر اللہ بیگ خان کا رشتہ دار بتا چکے ہیں، اب بیان کی تبدیلی ان کے لیے بے عزتی کا باعث ہوگی۔ احمد بخش خان نے چند دن اور صبر کی تاکید کرتے ہوئے غالب کو یقین دلایا کہ وہ خواجہ حاجی کے مرنے کے بعد یہ دو ہزار روپے دو نوں بہانوں غالب اور مرزا یوسف کو دینے لگیں گے۔

غالب اس پر خاموش ہو گئے، لیکن خواجہ حاجی جب ۱۸۴۵ء میں مر گیا اور اس کی موت کے بعد یہ دو ہزار روپے انھوں نے اس کے بیٹوں خواجہ جان اور خواجہ لہان کو دینا شروع کر دیے تو غالب کے لیے بزرگوار نرجسز کے سامنے اپنے استحقاق کی تلاش کے کوئی اور چارہ نہ تھا، لیکن انتہائی کوشش کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

(”برج غالب“، ۱۳۳)

حسین علی، مرزا:

گورنر جنرل کے دربار، منصفہ ۱۶ جولائی ۱۸۴۸ء، میں رنجی بہرائت کے وکیل کی

ہیثیت سے موجود تھا۔ غالب کی فارسی شاعری کا مذاج تھا۔

سٹرلنگ، اینڈریو:

دی کچی: اسٹرلنگ، اینڈریو

سراج الحق، مولوی:

عرفیت سراج الدین علی خان، گلشنِ عدالت میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر متمکن تھے۔ یہ محمد علی خان آف ہاندہ کے بڑے بھائی تھے اور مفتی کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے انگریزوں کی حکومت میں قاضی القضاۃ کے عہدے تک پہنچے۔ انہوں نے چند علمی کتابیں مرثی سے فارسی میں ترجمہ کیں۔ شاعری بھی کرتے تھے اور موجدِ قفص تھا۔ گلشن میں ۱۲۳۸ھ مطابق ۲۳-۱۸۲۲ء میں انتقال کیا۔

سوئٹن، ہارج (George Swinton):

۱۳ جولائی ۱۸۰۲ء کو ہندوستان پہنچا۔ ۱۸۰۵ء میں پرتھوی سیکرٹری کے دفتر میں اسٹنٹ کی حیثیت سے ملازم ہوا۔ نو سال بعد اس کو گورنر جنرل کا پرتھوی سیکرٹری بنا دیا گیا جب کہ گورنر جنرل ہائینڈہات کے دورے پر تھا۔ آخر کار ۱۸۱۷ء میں اسے حکومت کے پرتھوی سیکرٹری کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ ۷ دسمبر ۱۸۲۷ء سے اپنے ریٹائرمنٹ تک مئی ۱۸۳۳ء تک اس نے حکومت کے چیف سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔

## شمس الدین خان، نواب:

نواب احمد بخش خان کی میوانی بیوی بی بی بیگم کے بطن سے دو لڑکے شمس الدین خان اور ابرہیم علی خان اور دو لڑکیاں نواب بیگم نور جہاں گمبرہ پیدا ہوئیں۔ ان کی دو صری بیوی بیگم جانی سے، جو برلاس محل تھیں، دو لڑکیاں مہاروخ بیگم اور بادشاہ بیگم اور دو لڑکے نواب امین الدین خان اور ضیاء الدین احمد خان پیدا ہوئے۔ احمد بخش خان نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جائیداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دی۔ فیروز پور بھر کے کا علاقہ شمس الدین خان کو اور لوہارو کا علاقہ امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان کو دیا۔ شمس الدین خان نے اس تقسیم پر اعتراض کیا اور دھوا کیا کہ خلف اکبر ہونے کے سبب میں بلا حرکت ظہیر سے ساری ریاست کا مالک ہوں۔ فرانس ہاکنس نے انہیں ان کے باسیوں کا علاقہ لوہارو بھی دلوا دیا جس پر امین الدین خان نے گلگتے جا کر اپیل کی۔ فیصلہ شمس الدین خان کے خلاف ہوا۔ اس واقعے کے کچھ دن بعد ہی دلی میں کسی نے ریزپنٹ ولیم فریزر کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ لوگوں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ولیم فریزر کو نواب شمس الدین خان کے ایما پر ان کے ملازم کریم خان نے ہلاک کیا ہے، چنانچہ عدالت نے کریم خان کو پھانسی کی سزا دی۔ اسی جرم میں شمس الدین خان کو بھی پھانسی ہوئی۔ اردو کے مشہور شاعر نواب مرزا دلرخ انہی شمس الدین خان کے صاحب زادے تھے۔ شمس الدین خان کی موت کے بعد ان کی بیوہ نے، جو مرزا دلرخ کی والدہ تھیں، مرزا غلام ولی علی شاہ اور شاہ غفر سے نکاح کر لیا تھا۔

(”بزم غالب“، ص ۲۲۵)

## غفر علی خان، حکیم محمد:

منشی عاشق علی خان کے گلگتے سے لکھنؤ دیائی سفر پر چلے جانے کے بعد حکیم محمد غفر علی خان شاہ نودھ کے وکیل کی حیثیت سے گلگتے کے اس دربار میں ہاضمیں ہونے جو حکم اگست

۱۸۴۹ء کو منعقد ہوا تھا۔

عاشق علی خان، منشی:

مولوی خلیل الدین کے بعد اوائلی ۱۸۴۸ء میں شاہ اودھ کے وکیل مقرر ہوئے۔

عبد الکریم، مولوی:

اعلیٰ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے علوم حسین طہاٹانی کی ”سیرالمنہجین“ کی تھیں کی ہے اور ایٹ انڈیا کمپنی کے پریسبیڈنٹ میں میرمنشی کے عہدے پر مہینات تھے۔

فرانس ہاکنس (Francis Hawkins):

کول بروک کے مستقل ہونے پر فرانس ہاکنس نے اکتوبر ۱۸۴۹ء میں دہلی کے قائم مقام ریزیڈنٹ کا عہدہ سنبھالا اور اس عہدے پر ۱۸۳۱ء تک کام کیا۔ کیپ آف گڈ ہوپ میں ۸ دسمبر ۱۸۳۱ء کو استعفا کیا۔

فرانس ہاکنس کے ریزیڈنٹ مقرر ہونے پر غالب نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ نذر کیا:

ہاٹ آجئے بختِ تو ز دولتِ ہوا

بلِ گلشنِ ہدیٰ صبیٰ خدامانِ بہ ناز

فرانس ہاکنس پر نواب شمس الدین خان کا خاصا اثر تھا۔ چنانچہ فرانس ہاکنس ہی کی تائید پر نواب شمس الدین خان کو لوہارو کا علاقہ اپنے بھائیوں سے واپس ملے۔ اس کے کچھ دنوں

بعد کھینچے میں غالب کے مطالبے کو مسترد کرنے والا بھی فرانسس ہاکنس ہی تھا۔ جب غالب کو یہ معلوم ہوا تو انہیں اس سے نفرت ہو گئی اور انہوں نے اس قصیدے سے، جو اس کے لیے لکھا تھا، اس کا نام ہی نہیں نکالا، بلکہ فرانسس ہاکنس کی ریڈیو ٹیٹ کے عہدے سے سبک دوشی پر ایک، جو یہ قلم بھی لکھا:

ایا ستم زدہ غالب! ز ہاکنس سہل  
منہ بہ سوز بے کوزہ از شکایت داغ  
اگر بصورتِ خلافت تو کہوہ است رپورت  
وگر بہ خصم، بہ قتل تو بہتہ است جُناغ  
کھنا پناسے خرابی گندہ ہم ز نعت  
ندیدہ اہی کہ ہماں نکھی "غالب" است "بلوغ"

(”بریم غالب“، ص ۳-۳۰)

### فریزر، سائمن (Simon Fraser):

سائمن فریزر ایک متقی (کٹرک) کی حیثیت سے ہندوستان آیا اور دوسرے ہی سال فارسی کے سیکرٹری کا سادان (اسٹنٹ) مقرر ہو گیا۔ ۱۸۲۳ء میں وہ ڈیٹی پر شپہی سیکرٹری ہو گیا۔ اس حیثیت سے اس نے ۲۷ جولائی ۱۸۲۶ء تک کام کیا، جب اسے پریٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری کی حیثیت سے عارضی طور پر کام کرنے کے لیے کہا گیا۔ ۱۸۳۰ء میں اسے پریٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے قائم مقام پر لپل سیکرٹری کی حیثیت سے واپس بھیج دیا گیا۔

## فصلِ حقِ خیر آبادی، مولانا

آپ انیسویں صدی کے اکابر طاعین سے تھے۔ سرسید احمد خان نے ان کا سال ولادت ۱۲۱۱ھ اور رمضانِ مہینے ۱۲۱۲ھ بتایا ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد مولوی فضلِ امام سے حاصل کی پھر مولانا شاہ عبد القادر دہلوی کے حلقہ میں داخل ہو کر درسی حدیث لیا۔ یہاں بھی سیری نہ ہوئی تو شاہ دھومس دہلوی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

مولانا فضلِ حق نے اشارہ سال کی عمر میں وطن کے ریزیڈنٹ کے دفتر میں بطور سرخندہ دار اپنی خدمت کا آغاز کیا۔ کچھ دنوں بعد نواب جگر نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ بعد ازاں رام پور چلے گئے جہاں سے صدر الصدور بنا کر نکھتو بھیج دیے گئے۔ ”طاعین ہند“ کے مولف نے انھیں ۱۲۶۳ھ میں نکھتو میں دیکھا تھا، جہاں وہ حاکم کٹی اور شطرنج کے درمیان بھی حلقہ کو دوری دیتے تھے۔

مولانا فضلِ حق ۱۸۵۷ء کے ہٹا سے کے دوران وطن آئے اور یہاں وطنِ نوحہ پادشاہ سے ملاقاتیں کیں۔ چنانچہ ہٹا سے کے فرو ہونے پر انھیں انگریزوں کے ظلمت جہاد کا فتوا دینے پر گرفتار کر لیا گیا اور عدالت سے جبری دوام اور عبور و دیار سے خود کی سزا دی گئی۔ ان کے عقیدت مندوں اور متوسلین نے ان کی رہائی کے لیے بے انتہا کوشش کی۔ آخر کار جب ان کے صاحبِ دلوں نے ان کا پھانسی آوازوں سے کر اٹھان بخنے کو اس سے ایک دن پیش تر ۱۲ صفر ۱۲۷۲ھ کو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

فلسفہ و مانیات و طب کی بے مثال تصنیفات کے علاوہ ان کے اشعار کی حمدی بقول رحمان علی، صاحبِ تذکرہ ”طاعین ہند“، ہار جزا سے زائد ہے۔ امیرِ بنگالی کے مطابق ان کے عربی قصائد اس کے علاوہ ہیں۔

مولانا فضلِ حق غالب کے دوست ہی نہیں، مرنے اور مسمیٰ بھی تھے۔ اگر مولانا فضلِ حق کی ملاقات غالب سے نہ ہوتی تو بقول ڈاکٹر زور میر حتی میر کی وہ پیش گوئی پوری ہو جاتی



جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ”یہ لڑکا سہل بچے گا۔“ مولانا نے غالب کی فکر کو بھٹکا دیا اور ان کے خیالات کی اصلاح کی۔ یہی نہیں، ان کی بلی مشقت بھی دور کرنے کی کوشش کی۔ آپ ہی کی تصدیق پر نواب یوسف علی خان والی آرام پور نے اپنے اشعار غالب کو براے اصلاح لکھے۔  
 (”بزم غالب“، ص ۳۱۱)

قتیل، مرزا محمد حسن:

اصلاً کھتری ہندو تھے۔ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ لکھنؤ میں ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں انتقال کیا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے اور قتیل قنص کرتے تھے۔ نثر کی کتابوں کے بھی مصنف ہیں۔

کولبروک، ایڈورڈ (Edward Colebrook):

ایڈورڈ کولبروک نے ہارلس مشاف (Charles T. Metcalfe) کے بعد دہلی میں جولائی ۱۸۵۷ء میں ریزیڈنٹ کا عہدہ سنبھالا۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا تجربہ کار اور مستند کارکن تھا۔ کمپنی کی طرف سے اسے انتہاس سال ہو چکے تھے۔ یہ اس کا آخری عہدہ تھا۔ ۳۰ جون ۱۸۶۹ء کو وہ مالی بد عنوانی کے الزام پر معطل ہوا اور اسی سال ۲۹ دسمبر اپنے عہدے سے برحالت کر دیا گیا۔

حسن، منشی محمد:

غالب نے اپنے فارسی خطوط میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ تفصیلی حالات نہیں ملتے۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ جس وقت غالب لکھنے لگے تھے تو یہ گورنمنٹل کے فارسی دفتر سے

متعلق تھے۔ جب گلشن میں غالب کے کلام پر اعتراضات ہونے لگے تو علی اکبر خان اور محمد صمن بھی نے ان کے جوابات دیے تھے۔ اور ان اعتراضات کو رد کیا تھا۔ انہی کی تحریک پر غالب نے شبنوی "باہیات" لکھی تھی۔

جب لارڈ بینٹنک دہلی آئے تو محمد صمن بھی ان کے ہم رکاب تھے۔ لارڈ بینٹنک کے گلشن روانہ ہونے کے چند ہی دن بعد محمد صمن کا ستارہ گردش میں آ گیا۔ بعض ہمسندوں نے گورنر جنرل کو رپورٹ پہنچائی کہ محمد صمن خفیہ نوپسی کر رہے ہیں۔ چنانچہ انہیں معزول کر دیا گیا، تاہم ان پر لڑجرم قائم نہیں ہو سکی۔ بری ہونے پر انہیں اپنے وطن جانے کی لہازت مل گئی۔

("برم غالب"، ص ۳۳۳)

محمد علی خان، مولوی:

یہ سراج الدین علی خان، لائسنس القضاۃ صدر عدالت گلشن، کے چھوٹے بھائی تھے جن کا موہان کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ حکومت انگریزی نے ان کی لیاقت اور معاملہ فہمی کی بڑی قدر کی اور مختلف اوقات میں انہیں مختلف عہدہ ہائے جلیلہ پر مامور کیا۔ انہوں نے کچھ دن بدھیل کھنڈ کی عدالت میں بھی اپنے فرائض انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ آخر عمر میں انہیں ہائے کا صدر امین بنا دیا گیا تھا۔

"گلشن سخن" کے مؤلف نے محمد علی خان کا انتقال ۱۳۳۰ھ میں بتایا ہے اور چند شعر بطور نمونہ نقل کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔  
زیر نظر کتاب میں ۲۱۰ خطوط وہ ہیں جو مولوی محمد علی خان کو لکھے گئے ہیں۔

("برم غالب"، ص ۳۳۶ و بابا چرمدی)

میلنگم، سر جان (Sir John Malcolm):

اس کی پیدائش ۲ مئی ۱۷۶۹ء کو ہوئی۔ تعلیم ویسٹر کرک (Westerkirk) میں ہوئی۔ ہندوستان ۱۷۸۳ء میں آیا۔ اس نے لارڈ کلیک کی ماتحتی میں کام کیا اور دولت راول سندھیا سے ۲۲ نومبر ۱۸۰۵ء کو ایک معاہدہ کیا۔ ۱۸۰۸ء میں لارڈ منٹو نے اسے ایک خاص سفارتی مشن پر ایران بھیجا لیکن یہ فرانسیسی اثر کی وجہ سے ناکام ہوا۔ ۱۸۲۷ء میں اسے بمبئی کا گورنر بنادیا گیا۔ جہاں دسمبر ۱۸۳۰ء میں اس نے اس عہدے سے استعفا دے دیا۔

نصر اللہ بیگ خان، مرزا:

مرزا نصر اللہ بیگ خان، مرزا قوکان بیگ خان کے چھوٹے بیٹے اور غالب کے بھگے بھائی تھے۔ ان کی شادی نواب احمد بخش خان کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

انگریزوں نے مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنا چاہا۔ یہ صورت حال مرہٹوں کے لیے انتہائی خطرناک تھی، چنانچہ انہوں نے نصر اللہ بیگ خان کو آگرے کا قلعہ دار مقرر کیا۔ ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ کلیک نے پیش قدمی کی تو نصر اللہ بیگ خان نے بغیر کسی مزاہمت کے پورا شہر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ جس پر لارڈ کلیک نے انہیں ہی قلعہ دار رہنے دیا۔ انہیں چار سو سواروں کا دستہ دے دیا گیا اور سترہ سو روپے ملانہ تین خولہ مقرر ہوئی۔

جب لارڈ کلیک نے انگلستان جانے کا فیصلہ کیا تو اسے نصر اللہ بیگ خان کی وفاداریاں یاد آ گئیں، چنانچہ اس نے ۲۱ دسمبر ۱۸۰۵ء کو سولہ لاکھ روپے پر گئے تا مین حیات انہیں مرحمت کر دیے۔ یہ ہر گئے مسترا سے سولہ میل کے فاصلے پر تھے اور ان دونوں پر گنوں کی آمدنی ایک لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ تھی۔ لیکن نصر اللہ بیگ خان کو اس جاگیر سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ ۱۸۰۶ء میں پاتھی سے گر کر ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور زخم خراب ہو جانے کے باعث ان کا انتقال ہو گیا۔ انگریزوں نے وہ دونوں پر گئے واپس لے لیے

اور ان کے پس ماندگان کے لیے پانچ ہزار روپے سالانہ کی رقم مقرر کر دی۔  
 ("برص غالب"، ص ۳۸۷)

واقعہ، نورالعین:

نام نورالعین، واقعہ نقص، بٹالے سے تعلق تھا، جہاں ان کے والد قاضی کے  
 عہدے پر مہتمم تھے۔ واقعہ قاری میں شاعری کرتے تھے۔ ان کا ایک دیوان  
 ۸۰۰ غزلوں پر مشتمل موجود ہے۔ ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۶ء میں انتقال ہوا۔

یوسف خان، مرزا:

غالب کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۲۱۳ھ ہے۔ غالب کی تقلید میں وہ  
 بھی ترک وطن کر کے دہلی میں غالب کے مکان کے قریب ہی آ کر رہنے لگے۔ اٹھائیس سال کی  
 عمر میں لہک و لیا لگی کا دورہ پڑا۔ کسی کو ستاتے نہ تھے نہ شورو مٹا کرتے تھے۔  
 ۱۸۵۷ء کے فدر میں انگریزوں کے ظلم و ستم سے ڈر کر ان کی بیوی اور لڑکیوں نے  
 بے پردگی کی طرف جاگ جانے میں مافیت بھی اور انہیں ایک بوڑھے دربان اور ایک بڑھیا  
 کنیز کے ساتھ چھوڑ دیا۔ مرزا یوسف حالت جنوں میں تھے۔ گولیوں کی آواز سن کر گھر سے  
 باہر نکلے اور مارے گئے۔ ان کی تمیز و تکفین کی تفصیلات استانی و درو انگیز ہیں۔ ان کے مارے  
 جانے کی تاریخ ۲۹ صفر ۱۲۷۳ھ ہے۔

("برص غالب"، ص ۳۱۲)

والد حسن، مولوی:

شاہد یہ صاحب وہی ہیں۔ جنہیں غالب نے قاضی کے عہدے پر مقرر ہونے کی، اپنے  
 یکم جنوری ۱۸۳۸ء کے خط میں، مبارک باد دی ہے۔

غالب کے اردو خطوط کے رخصتوں کے فارسی خطوط یک جہ نہیں کیے گئے۔ مختلف جمعوں (پنج آہنگ، سآثر غالب، متفرقات غالب اور نامہ ہائے فارسی غالب) میں نہیں، مختلف ادبی رسائل میں بھی پھرے ہوئے ہیں۔ اور یادگار غالب نے ان خطوط کو یک جا کرنے اور پھر ترجمہ کرائے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ”پنج آہنگ“ میں شامل خطوط کا ترجمہ (از مرزا جبر) شائع ہو چکا ہے۔ اب ”نامہ ہائے فارسی غالب“ کا ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اور یادگار غالب کی فرمائش پر یہ ترجمہ اردو کے ممتاز شاعر پر تور وہیلہ نے کیا ہے۔ غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ کرنا ایک نہایت مشکل کام ہے۔ پر تور وہیلہ اس مشکل مرحلے سے اس لیے آسانی سے گزرے ہیں کہ وہ غالب ہی کے نہیں، فارسی زبان کے بھی مزاج دان ہیں۔ ”سآثر غالب“، ”نور“، ”متفرقات غالب“ میں شامل خطوط کا ترجمہ وہ کر چکے ہیں، اور افسوس فیرماں فارسی خطوط کے ترجمے کا کام ان کے پیش نظر ہے۔

